فقہ المعاملات

یعنی

# جدید معاملات کے شرعی احکام

۳ جلد یکجا مجلد


جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب

معین مفتی و استاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی


اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی، پاکستان فون: 2631861

فقہ المعاملات

یعنی

# جدید معاملات کے شرعی احکام

جلد دوم

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب

دار الاشاعت

# فہرست مضامین

| صفحہ نمبر | عنوانات | نمبر شمار |
|---|---|---|

باہمی تعلقات اور معاملات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا چنانچہ تجارت میں اضافے کی خاطر انسان نے نت نئے راستے نکالے اور معاملات کی مختلف صورتیں وجود میں آئیں ان ہی صورتوں میں سے ایک عقد شرکت بھی ہے جس کی مزید مختلف قسمیں اور متنوع اقسام زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ منظر عام پر آتی رہیں اور بعض انسانوں نے قبول کر کے اختیار کیا انہی انسانوں میں سے اہل عرب کو بھی شرکت کی ان اقسام کا علم حاصل ہوا اور انہوں نے ان کے مطابق تعامل اور باہمی لین دین کا عقد کرنا شروع کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے جب دین اسلام کی آفاقی تعلیمات کی تبلیغ کی اور شریعت کو نافذ فرمایا تو ان تعلیمات اور احکامات کا ایک جزو عظیم "معاملات" بھی تھے چنانچہ آپ نے ان معاملات میں سے جو تمام بنی نوع انسان کے لئے ضروری اور مناسب تھے ان کو باقی رکھا اور جو ان میں سے دین حق اور عدل و انصاف کے منافی تھے وہ اس سے اس کا دین و دنیا کا ضرر تھا ان کو ممنوع قرار دے دیا۔

جب صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں اسلام جزیرۂ عرب سے دنیا کے دور دراز خطوں تک پھیلا تو مختلف شہروں اور علاقوں کے معاملات بشمول عقد شرکت کے نئی نئی اور مختلف صورتیں سامنے آئیں جو اس سے پہلے موجود نہ تھیں لہٰذا فقہاء کرام نے اسلام کے ذریں اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اجتہاد کیا اور اجتہادی طرق ریزی کے بعد ان میں سے بعض صورتوں کو جائز اور بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا اور مزید یہ کہ ادلہ اربعہ کی روشنی میں ایسے اصول مستنبط فرمادیئے جن سے بعد میں آنے والوں کو ان کی روشنی میں جزوی مسائل کا علم ہو جائے۔

## شرکت کی اقسام:

شرکت کی ابتداء دو قسمیں ہیں:

۱۔ شرکت املاک ۲۔ شرکت عقود

## شرکت املاک:

اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) دو یا دو سے زیادہ افراد کا کسی چیز کا مشترکہ طور پر مالک بننا مثلاً کسی گھر، زمین یا کاری کا بطور خرید اری مالک بن جانے والی کو "شرکت ملک اختیاری" کہا جاتا ہے۔

(۲) دو یا دو سے زیادہ افراد بطریق میراث کسی گھر یا گاڑی، دکان وغیرہ کے مالک

ہو جائیں تو یہ شرکت ملک جبری کہلاتی ہے۔ یعنی اس میں شرکت میں دونوں کے اختیار کا دخل نہیں ہے۔

### شرکت املاک کا حکم:

شرکت املاک کا حکم یہ ہے کہ ان شرکاء میں سے ہر ایک دوسرے کے حصے کے حق میں اجنبی ہے، اس لئے کسی شریک کے لئے جائز نہیں کہ دوسرے کے حصے میں بلا اجازت کسی قسم کا تصرف کرے، لہذا اگر کوئی شریک مشترک چیز کو دوسرے کی اجازت کے بغیر فروخت کر دے تو بیع دوسرے کی اجازت پر موقوف ہوگی، ہاں البتہ اپنا حصہ اپنے شریک کے ہاتھ فروخت کرے تو بیع نافذ ہو جائے گی کیونکہ یہ مبیع اس کے حوالے کرنے پر قادر ہے۔

قال في الاختيار: الشركة نوعان: شركة ملك، وشركة عقد. وشركة الملك نوعان: جبرية واختيارية. أما الجبرية فأن يختلط مالان لرجلين اختلاطا لا يمكن التمييز بينهما أو يرثان مالا. والاختيارية: أن يشتريا عينا أو يوهب لهما أو يخلطا مالهما، وفي جميع ذلك كل واحد منهما أجنبي في نصيب الآخر لا يتصرف فيه إلا بإذنه لعدم إذنه له فيه، ويجوز بيع نصيبه من شريكه في جميع الوجوه. (الاختيار لتعليل المختار: ١٢/٣)

## شرکت عقد

شرکت عقد: دو شریکوں کے درمیان یا کئی شرکاء کے درمیان اصل سرمایہ اور منافع میں شرکت کا معاملہ طے کرنا۔

### شرکت عقد کی اقسام:

فقہائے کرام نے شرکت عقد کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں، فقہائے احناف کے نزدیک شرکت عقد کی چھ قسمیں ہیں،

(١) شرکت الاعمال

(٢) شرکت الاموال

(۳) شرکت الوجوہ

اور پھر ان تینوں کی دو قسمیں ہیں

(۱) شرکت المفاوضہ

(۲) شرکت العنان

اس طرح کل ملا کر چھ قسمیں بن جاتی ہیں۔(۱)

## (۱) شرکت الاموال:

دو یا زیادہ افراد ایک معین سرمایہ اس شرط پر لگائیں کہ ان میں سے ہر ایک یا بعض افراد کام کریں گے اور نفع دونوں میں مشترک ہوگا۔ مثلاً زید اور بکر ایک ایک ہزار روپے ملا کر لگائیں اور یہ طے کر لیں کہ ہم دونوں نفع میں سے آدھا آدھا لیں گے۔(۲)

## (۲) شرکت الاعمال:

اسے شرکت صنائع ابدان یا تقبل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہیں کہ دو یا زیادہ افراد کوئی ایسا کاروبار شروع کرتے ہیں جس میں لوگوں سے کام اجرت پر لئے جاتے ہوں اور جو کمائی ہو اس میں دونوں شریک ہوں۔ اب دونوں مختلف پیشہ ور بھی آپس میں مل کر ایک مشترکہ ادارہ قائم کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سروسز کے کاروبار میں بھی اشتراک کیا جا سکتا ہے جس کی تفصیل آگے تیسرے باب میں ذکر کی جائے گی۔

نفع کی تقسیم کام کے اعتبار سے نہیں بلکہ حسب قرارداد ہوگی۔ اگر یہ طے کیا کہ ہر شخص اپنے کام کے بقدر منافع لے گا یا کچھ طے نہ ہو تو شرکت نہیں رہے گی۔

## (۳) شرکت الوجوہ:

اسے بعض فقہاء کرام شرکت الذمم بھی کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شریک افراد کے پاس مال نہیں ہوتا وہ اپنی وجاہت اور اپنی ساکھ کے ذریعہ تاجروں کے یہاں سے سامان

---

(۱) [illegible]

(۲) [illegible]

(۲) دونوں کی شرکت نفع میں ہو یعنی یوں معاملہ طے ہو جائے کہ اس تجارت سے جو نفع حاصل ہوگا، اس کا آدھا یا تہائی یا چوتھا حصہ صاحب مال کا بقیہ مضارب کا۔ یعنی کسی ایک کے لئے نفع کا حصہ مقرر کر دینا صحیح نہیں ہے کہ مثلاً ہر ماہ الگ سے دو ہزار صاحب مال کا ہوگا بقیہ مضارب کا چونکہ اس میں احتمال ہے کہ کل نفع ہی دو ہزار یا اس سے کم حاصل ہو تو مضارب کا بڑا نقصان ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ نفع کی تقسیم فیصد کے تناسب سے ہو۔

(۳) نفع ونقصان دونوں میں شرکت ہو یعنی اگر نفع ہوا تو طے شدہ شرط کے مطابق تقسیم کیا جائے گا اور اگر نقصان ہوا تو یہ رب المال یعنی (سرمایہ فراہم کرنے والا) کو پورا نقصان برداشت کرنا پڑے گا، باقی مضارب کو بھی اپنے عمل کا کوئی بدلہ نہیں ملے گا، اسطرح وہ بھی نقصان میں شریک ہوا۔

(٤) مال مکمل طور پر مضارب کے حوالے کرنا ضروری ہے تاکہ اس کو تجارت میں اختیار کلی حاصل ہو۔

(۵) مضارب کا حصہ نفع متعین ہونا ضروری ہے (مثلاً نفع کا آدھا حصہ) اگر رأس المال میں شرکت کو ضروری قرار دیا جائے تو مضاربت فاسد ہو جائے گی۔

قال صاحب الهداية . ومن شرط المضاربة ان يكون الربح بينهما مشاعاً،اى غير محدود، لايستحق احدهما دراهم مسماة من الربح ، لان ذلك يقطع الشركة بينهما ، فانْ شرط زيادة عشرفله اجر مثله لفساد الشركة فلعله لا يربح الاهذا القدر فتنقطع الشركة، اى تبطل و الربح لرب المال لانه نماء ملكه . وللعامل ، اى المضارب اجر المثل . (هداية : ٣/٢٣٦)

## نفع کی مقدار متعین کرنے کی وجہ سے عقد شرکت فاسد ہو جاتا ہے؟

آج کے دور میں شرکت کی ایک صورت یہ بھی چل نکلی ہے کہ ایک شخص دکان یا فیکٹری وغیرہ کا مالک اپنے رشتہ داروں یا جاننے والوں سے کہتا ہے کہ تم کاروبار میں اتنی رقم شامل کرو تو ہر مہینے تمہیں اتنا فیصد نفع ملے گا۔ وہ رقم شامل کرتا ہے اور ہر ماہ اس کو نفع کی مقررہ مقدار مل جاتی ہے اس کو عام طور پر لوگ جائز کاروبار سمجھتے ہیں حالانکہ شرعی نقطہ نگاہ سے اس میں کئی خرابیاں ہیں۔

(۱) کسی بھی کاروبار میں سرمایہ پر نفع متعین کر کے دینا یہ قرض دے کر سود وصول کرنے کے حکم میں داخل ہے جو صریح حرام ہے۔

(۲) اس میں رقم شامل کرنے والا نقصان کی صورت میں نقصان برداشت نہیں کرتا، وہ دکاندار کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے، جبکہ شرعاً شرکت کے لئے ضروری ہے کہ نفع نقصان دونوں میں شرکت ہو، لہذا یہ شرکت فاسدہ ہوئی شرکت کی یہ صورت ناجائز ہے لہذا اس سے اجتناب لازم ہے۔

وفي الدر المختار: كتاب الشركة ... وشرطها كون المعقود عليه قابلا للوكالة، فلا تصح في مباح كاحتطاب، وعدم ما يقطعها كشرط دراهم مسماة من الربح لاحدهما لانه قد لا يربح غير المسمى وحكمها الشركة في الربح. وفي رد المحتار تحت قوله "وحكمها الشركة" واشتراط الربح متفاوتا عندنا صحيح فيما سيذكر.

(رد المحتار ۳/۳۲۲)

اب یہاں سے شرکت کے بارے میں چند مسائل کو سوال و جواب کی صورت میں نقل کیا جاتا ہے تاکہ جزئیات سمجھنے میں آسانی ہو اور مسائل منقح ہو جائیں۔

## شرکت و اجارہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس بارے میں کہ زید دکان میں اپنے ساتھ شریک بکر، خالد، جعفر، امین ملا کر کل پانچ شریک قرار دیتا ہے جن میں زید اور بکر دو بڑے حصہ دار ہیں اور پچھلے تینوں چھوٹے حصہ والے ہیں اور چونکہ پچھلے تینوں شریک خالد، جعفر، امین کے حصوں کا نفع ان کے حق المحنت کو دیکھتے ہوئے ناکافی ہے اس لئے چاہتا ہے کہ بقدر حصہ نفع کے علاوہ خالد کو چار سو روپیہ ماہوار اور جعفر و امین کو ڈھائی ڈھائی سو ماہوار دکان سے دیا کرے تو آیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو کونسی صورت ایسی ہے جس میں ان کا حق المحنت پورا ان کو مل جایا کرے وہ آسان حالت اس کے لئے ان کا حصہ بڑھا دینے کے بعد پھر گھٹانا زیادہ دشوار ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کی مذکورہ تنخواہوں میں حسب موقع کمی بیشی کی جایا کرے۔ بینوا توجروا

الجواب: صورت مذکورہ میں شریک کا اجیر ہونا لازم آتا ہے اور شرکت و اجارہ دو جمع نہیں

ہو سکتی ہے اس کی صورت جائز یہ ہے کہ اصل سرمایہ میں تو ان شرکاء کا حصہ بڑھایا جائے مگر نفع میں بڑھایا جائے مثلاً جس شریک کا حصہ دو دکان میں ہے اس کا حصہ نفع میں ۶۰٪ کر دیا جائے اور اس کے لئے تمام شرکاء کی رضا شرط ہے پھر یہ زیادت نفع بھی اگر دائما منظور نہ ہو تو اس کے لئے باہمی معاہدہ تحریری طور سے ایک میعاد مقرر کر دی جائے کہ فلاں فلاں شریک کا اتنی مدت کاروبار کی وجہ سے فلاں میعاد تک ان کا حصہ نفع میں بڑھایا جاتا ہے اور شرکت عنان میں راس المال کی نسبت سے نفع کا زیادہ کرنا جائز ہے۔

[illegible]

[illegible]

باقی شریک کو ملازم رکھنے کا جو مسئلہ دریافت کیا ہے اس کو ناجائز قرار دیا ہے، اس بارے میں حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ شریک کو ملازم رکھنا جائز ہے۔ چنانچہ احسن الفتاویٰ (۳۷۸/۷) میں اس کی تفصیل موجود ہے جس کا خلاصہ ہم نے جلد اول میں نقل کیا ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

## باپ بیٹوں کی مشترک آمدن کا حکم:

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ زید کے پانچ فرزند ہیں

(۱) عمر (۲) خالد (۳) ولید (۴) محمد علی (۵) ولی محمد

اور تین نواسے نابالغ ہیں

(۱) عبداللہ (۲) عبدالرحمن (۳) فاطمہ

زید نے اپنی ذاتی محنت سے ہزار روپے کے نقود اور جائیداد وغیرہ کسب کئے پھر جب عمر، خالد وغیرہ ہوشیار اور قابل کسب ہوئے تو بمعیت ان کے ہزار روپیہ کا مال تھا، غرض فی الحال زید کے پاس پانچ ہزار کا مال موجود ہے اور کاروبار زید کے ہاتھ میں ہے اموال مشترک ہیں کس نے کس قدر کسب کیا اور کہاں تک محنت کی منضبط نہیں ہے اور نہ انضباط متحقق ہو سکتا ہے۔ ولید نے عرصہ آٹھ سال تک علم حاصل کیا اس نے سب کے نقود مشترکہ میں سے بہت سا روپیہ خرچ کئے طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ تھوڑے عرصہ تک کسب معاش میں شریک رہا ہے اور ولی محمد کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔

اب زید فرزندوں سے اور فرزند برابر ایک دوسرے سے جدا ہونا چاہتے ہیں جن کی تقسیم شرعاً
ان میں کیسے ہوگی؟ آیا بقدر کسب بطور تخمین ہوگی یا جملہ اموال زید کا قرار دے کر فرزندوں کا حصہ
دیا جائے گا اور ایام ماضیہ کا نان ونفقہ اجر مثل سے وضع ہوگا یا حکم تبرع کا دیا جائے گا، ولیمہ کا کیا حکم
ہے کہ اس نے زیادہ خرچ کیا، ولی احمد کی شادی کا خرچ حسب حیثیت کس پر ہے یا صرف باپ کے ذمہ
ہوگی؟ نابالغ اولاد کو بھی حصہ ملے گا یا نہیں؟ نیز تحریر فرمائیں کہ تقسیم چار ہزار میں جاری ہوگی یا پانچ
ہزار میں اور یہ بھی حکم بیان فرمائیں کہ صورت مستفسرہ میں کہ کاروبار کسی فرزند کے ہاتھ میں ہو تو کیا حکم
ہے؟ بینوا بالکتاب توجروا الاجر جزیلاً عند الوہاب

الجواب: زید نے جو اپنے لڑکوں کو کاروبار میں اپنے ساتھ شریک کیا ہے تو اس کی صورت
کیا تھی؟ آیا زید نے ہر بیٹے کو کچھ رقم سرمایہ بنا کر دے دیا تھا، پھر وہ رقم یا سرمایہ کاروبار میں لگا کر لڑکا
شریک تجارت ہوا یا باپ نے کسی بیٹے کو کچھ رقم ہبہ نہیں دی، نہ سرمایہ دیا اور نہ بیٹوں کے پاس اپنی
ذاتی رقم یا سرمایہ تھا جس کو کاروبار میں ملا کر وہ شریک ہوئے ہوں بلکہ بیٹے ویسے ہی بدون رقم دیئے
کام کرنے لگے اور اس شرکت سے کام کو ترقی ہوئی۔ پس صورت اولیٰ میں تو یہ البتہ شرکت ہے اور
ہر شخص اپنی رقم و سرمایہ کی نسبت سے اس وقت اصل نفع میں مستحق ہوگا اور صورت ثانی میں یہ شرکت ہی
نہیں بلکہ کل سرمایہ زید کی ملکیت ہے اور سب لڑکے اس کے معین شمار ہوں گے اور جس لڑکے پر
زیادہ خرچ ہوا اس صورت میں وہ سب باپ ہی کا خرچ ہوا اس سے زیادہ کے رجوع کا حق کسی
کو بھی نہیں، نیز اولاد کو اپنے سے علیحدہ کرنے کے لئے زید کو اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ اس
سرمایہ کو ان میں تقسیم کرے بلکہ اولاد بالغین کو بدون کچھ سرمایہ دیئے بھی الگ کر سکتا ہے اور اگر ان
کو کچھ سرمایہ دے کر الگ کرے تو یہ اچھا ہے اور اس صورت میں سب کو برابر سرمایہ دے اور
نابالغوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے، بلوغ سے پہلے ان کو الگ نہیں کر سکتا۔

فقال في الحامدية: الأب وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن
لهما شيء ثم اجتمع لهما مال يكون كله للأب إذا كان الابن في
عياله وأجاب خير الرملي عن سؤال في ولد حيث كان من جملة
عياله والمعين له في أموره وأحواله فجميع ما حصله بكده وتعبه فهو
ملك خاص لأبيه لا شيء له فيه حيث لم يكن له مال ولو اجتمع له

بينهما اذا شرطا العمل عليهما ان تساويا مالا وتفاوتا ربحا جاز عند علمائنا الثلاثة رحمهم الله تعالى خلافا لزفر رحمه الله تعالى والربح بينهما على ما شرطا وان عمل احدهما فقط وان شرطاه على احدهما فان شرطا الربح بينهما بقدر رأس مالهما جاز ويكون مال الذي لا عمل له بضاعة عند العامل له ربحه وعليه وضيعته وان شرطا الربح للعامل اكثر من رأس ماله جاز ايضا على الشرط ويكون مال الدافع عند العامل مضاربة ولو شرطا الربح للدافع اكثر من رأس ماله لا يصح الشرط ويكون مال الدافع عند العامل بضاعة لكل واحد منهما ربح ماله والوضيعة بينهما على قدر رأس مالهما ابدا هذا حاصل ما في العناية اهـ ما في النهر. قلت وحاصل ذلك كله انه اذا تفاضلا في الربح فان شرطا العمل عليهما سوية جاز ولو تبرع احدهما بالعمل وكذا لو شرطا العمل على احدهما وكان الربح للعامل بقدر رأس ماله او اكثر ولو كان الاكثر لغير العامل او لاقلهما عملا لا يصح وله ربح ماله فقط، هذا اذا كان العمل مشروطا الخ.

[ردالمحتار: ۳/۳۱۲]

## مضارب اگر کوئی وصیت کئے بغیر فوت ہو جائے تو مال کی حفاظت اور ضمان کا حکم:

**سوال:** کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمرو سے بطور مضاربت روپیہ لے کر تجارت میں لگا رکھے تھے اس کا یعنی زید کا انتقال ہو گیا اور مرتے وقت کسی قسم کی وصیت نہیں کی اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ مال تجارت کس کا حق ہے اور اس کی حفاظت کس کے ذمہ ہے؟ رب المال کے یا مضارب کے؟ اور اگر وہ مال تجارت اتفاق سے ضائع ہو جائے تو نقصان کس کا سمجھا جائے گا اور آیا اس روپیہ کی بابت وارثان زید پر عمرو کو کسی قسم کا جبر کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

**الجواب:** في العالمگيرية: (۵/۳۰۰) وان كانت المضاربة حين مات المضارب عروضا او دنانير (اي وكان رأس المال دراهم)

فاراد رب المال ان یبیعها مرابحة ولم یکن له ذلك والذی یلی بیعها وصی المضارب فان لم یکن له وصی جعل القاضی له وصیا یبیعها فیوفی رب المال رأس ماله وحصته من الربح ویعطی حصة المضارب من الربح غیر مادة وقال فی المضاربة الصغیرة یبیعها وصی المیت ورب المال وما ذکرها اصح کذا فی المبسوط.

اس سے معلوم ہوا کہ اصح یہ ہے کہ وصی المضارب نہ ہونے کی صورت میں یا تو قاضی اس کی جانب سے وصی مقرر کر دے جو مال فروخت کرکے راس المال اور نفع میں سے مضارب کو دیدے یا رب المال بدون مرابحہ اس مال کو فروخت کر کے سرمایہ وصول کر لے اور جو چیز اتفاقاً کم ہوگئی ہے اس کا ضمان واجب نہیں، اگر تعدی سے نقصان ہوا ہو تو تعدی کرنے والے پر ضمان ہے۔ واللہ اعلم

## مضاربت میں کل نقصان رب المال کے ذمہ ہوگا مضارب کے ذمہ کچھ نہیں:

**سوال:** زید نے بکر کو روپیہ دیا، بکر کام کرنے والا ہے، اور زید صرف روپیہ دینے والا ہے اور ان دونوں میں منافع میں یہ شرط قرار پائی ہے کہ زید ایک حصہ منافع لے اور بکر دو حصے اسی طرح نقصان میں بھی زید ایک حصہ نقصان اٹھائے اور بکر دو حصے، کیا یہ طریق معاملہ شرعاً درست ہے اس کا منافع سود ہوگا یا نہیں؟

**الجواب:** صورت مذکورہ میں عقد مضاربت صحیح ہے لیکن کل نقصان فقط روپیہ والے کے ذمہ ہوگا (مضارب) کام کرنے والے کے ذمہ اس میں سے کچھ نہ ہوگا۔

کما فی الدر: فی الخلاصة کل شرط یوجب جهالة فی الربح او یقطع الشرکة فیه یفسدها والا بطل الشرط وصح العقد اعتباراً بالوکالة وفی رد المحتار (قوله بطل الشرط) کشرط الخسران علی المضارب. (۴/۷۴۲) واللہ اعلم

## مشترک جائیداد کی تقسیم کی ایک صورت کا حکم:

**سوال:** زمینداروں نے باقاعدہ جائیداد تقسیم کر لی اور ہر ایک بقدر اپنے حصہ کے قابض ہو گیا اس کو خانگی تقسیم کہتے ہیں، چند دنوں کے بعد سرکاری طور پر بٹوارہ کرنے کی کسی نے درخواست

دیدی جس کو سرکاری بٹوارہ کہتے ہیں اور یہ بٹوارہ سے آگے تقسیم شروع ہوئی ہے جس میں بعض نے امین کو رشوت دے کر دوسرے شخص کی عمدہ زمین یا درخت یا آبپاشی اپنے نام لکھوالیا اور اپنی خراب زمین وغیرہ اسی قدر ان کے نام کروادی۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا کیا جائے خصوصاً اس صورت میں جبکہ مورث نے ایسا کیا ہو اور ورثاء کو اصل مالک کا پتہ بھی نہ ہو؟

الجواب: ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں کیونکہ تقسیم میں مساوات لازم ہے مقدار میں بھی، کیفیت میں بھی۔ اگر مورث نے ایسا کیا ہو تو وارث کو چاہئے کہ اپنی اصل زمین لے لے اور دوسرے کی واپس کردے باقی اس کے مورث نے جو گناہ کیا اس کا یہ تدارک نہیں اور اگر دوسرا شخص کچھ رقم بطور تاوان کے لے کر اسی سرکاری بٹوارہ پر راضی ہو جائے تو اس کو اسی طرح یا کسی اور طرح راضی کرلیا جائے۔ الغرض دوسرے کی چیز پر بدون اس کی رضامندی کے قبضہ درست نہیں اور امین کی تبدیل قسمت پر صرف اس شرط پر راضی تھے کہ اس کو رشوت دے کر قسمت کرایا جائے جب اس کے خلاف کیا گیا تو تبدیل رضاء سے نہ ہوئی بلکہ غصباً ہوئی۔ واللہ اعلم

## بھائیوں کی مشترکہ کمائی سے منتظم بھائی نے مشترکہ جائیداد خریدی تو کیا سب میں برابر تقسیم ہوگی؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین صورت ذیل میں: تین بھائی ہیں ان کے معاملات سب مشترک ہیں جائیداد، مکانات، کھانا پینا اور سب اشیاء مشترک ہیں ان میں دو بھائی برسر روزگار ہیں اور ایک بیروزگار ہے اور گھر پر رہتا ہے اور گھر کا اور جائیداد کا انتظام سب اس کے ہاتھ میں ہے، باپ بھی ان کا اپنے روزگار سے روپیہ حاصل کرتا ہے اور یہ دونوں بھائی بھی حاصل کرتے ہیں، یہ سب روپیہ منتظم بھائی کے ہاتھ سے گھر کی ضروریات میں بلا تفصیل الاشتراک خرچ ہوتا ہے اور اس مشترک آمدنی سے منتظم بھائی نے باپ سے مشورہ کے بعد کچھ جائیداد خریدی کئی سال کے بعد اس منتظم بھائی کا لڑکا برسر روزگار ہو جاتا ہے اور اپنے روزگار سے اس کو زیادہ روپیہ حاصل ہوا وہ روپیہ بھی اسی طرح بلا تفصیل الاشتراک خانگی ضروریات میں خرچ ہوتا رہا اور اس سے بھی منتظم بھائی نے جائیداد بلا تفصیل الاشتراک خریدی، اس کے روزگار ملنے کے دو تین سال بعد باپ کا انتقال ہو گیا، انتقال کے بعد بھی ان تینوں بھائیوں کے معاملات مشترک رہے، باپ کے مرنے کے بعد بھی منتظم

بھائی نے بھی جائیداد خریدی جس میں منجھلے بھائی کے لڑکے کا روپیہ زیادہ خرچ ہوا اور باقی دونوں بھائیوں کا کم مگر یہ جائیداد کسی کی تنہا نہیں بلکہ مشترک خریدی گئی البتہ اتنا معلوم ہوا کہ ان دونوں بھائیوں کا روپیہ جائیداد کے خریدنے پر کم خرچ ہوا اور منجھلے بھائی کے لڑکے کا حاصل کردہ روپیہ جائیداد پر زیادہ خرچ ہوا تفصیل معلوم نہیں۔ اب یہ تینوں بھائی جائیداد کی تقسیم کرانا چاہتے ہیں شریعت و فقہ حنفی کے مطابق یہ جائیداد تینوں بھائیوں میں فی السویہ برابر تقسیم ہوگی یا منجھلے بھائی کو زیادہ حصہ ملے گا اور کتنا زیادہ؟ کیوں کہ اس کے لڑکے کا جائیداد خریدنے پر زیادہ روپیہ خرچ ہوا اور اگر کسی صورت سے معلوم ہو جائے کہ منجھلے بھائی کے لڑکے کا روپیہ جائیداد کے خریدنے پر اتنا خرچ ہوا اور دونوں بھائیوں کا اتنا تو اس صورت میں یہ جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟ تینوں بھائیوں کو برابر حصہ ملے گا یا منجھلے بھائی کو زیادہ؟ غرض دونوں صورتوں کا حکم مفصل تحریر فرمایا جائے یہاں لوگوں کا رواج تو یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں تقسیم علی السویہ ہوتی ہے، یہ نہیں کہ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم حصہ ملے۔

**الجواب:** سئل في اخوة خمسة تلقوا تركة عن ابيهم فأخذوا في الاكتساب والعمل فيها جملة كل على قدر استطاعته في مدة معلومة فحصل الربح في المدة فهل تكون الشركة فيما حصلوا بالاكتساب بينهم سوية وان اختلفوا في العمل والرأي كثرة وصوابا، الجواب نعم اذ كل واحد يعمل لنفسه ولاخوته على وجه الشركة واجاب خير الرملي بقوله هو بينهم على السوية حيث لا يميز كسب هذا من كسب هذا ولا يختص احدهم بشيء ولا زيادة على الآخر وان تفاوتت ... فقد ... اختلطوا ... الآخر ما قال وافتى الخ: وافاده ... ۱/۹۳ من تنقيح الفتاوى الحامدية

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ صورت مسئولہ میں یہ جائیداد تینوں بھائیوں میں بحصہ مساوی تقسیم ہوگی کیونکہ ہر بھائی نے اپنی کمائی کو دوسرے کے ساتھ خلط کر رکھا امتیاز نہیں کیا اور سب کا خرچ وغیرہ مشترک ہی چلتا رہا ہے تو اب تفاوت کو ساقط کیا جائے گا اور سب کو بحصہ مساوی شریک سمجھا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

(ماخوذ از امداد الاحکام جلد ۳)

## بلا اذن شریک تصرف جائز نہیں:

سوال: عنایت اللہ اور علی محمد دونوں نے مشترکہ (۳۵) ہزار میں گاڑی خریدی جس میں سے علی (۱۶) ہزار روپے نقد ادا کیے اور باقی (۱۹) ہزار ایک مدت معینہ تک ادھار رہے۔ دو تین مہینے کے بعد علی محمد ایران چلا گیا جب روپے دینے کا وقت مقرر آیا تو عنایت اللہ کے پاس پیسے نہیں تھے، قرض خواہ نے عنایت اللہ کو مجبور کیا کہ روپے دو ورنہ گاڑی پر قبضہ کر لوں گا، مجبور ہو کر عنایت اللہ نے گاڑی تیس (۳۰) ہزار میں فروخت کر دی۔ چند دن کے بعد علی محمد بھی آ گیا اور اعتراض کیا کہ تم نے پانچ ہزار کے نقصان پر گاڑی کیوں دی؟ عنایت اللہ نے اپنا عذر پیش کیا مالک نے بہت تنگ کیا آخر میں کیا کروں؟ اب یہ بیع ہوئی یا نہیں اور نقصان کس پر آئے گا؟

بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

صرف عنایت اللہ کے حصہ کی بیع صحیح ہے کیونکہ گاڑی علی محمد اور خریدار کے درمیان مشترک ہے، اگر خریدار اشتراک پر راضی نہیں تو وہ بیع کو فسخ کر کے گاڑی واپس کر سکتا ہے۔

قال في شرح التنوير: نحو حمام وطاحون وخيمة ودابة حيث يصح بيع حصته اتفاقا اهـ. (ردالمحتار: ۳/۳۶۶)

## مشترک مکان کی بلا اجازت مرمت:

سوال: زید کی تحویل میں اس کے مرحوم والد کا متروکہ ایک مکان ہے جو ابھی تک ورثاء میں تقسیم نہیں ہوا، مکان کے ایک حصہ سے جو کرایہ حاصل ہوا وہ زید نے تمام ورثاء کا حق سمجھتے ہوئے بطور امانت رکھا تاوقتیکہ شرعی تقسیم ہو جائے۔ اسی دوران میں مکان کا ایک حصہ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے قابل مرمت ہو گیا، مکان کی شرعی تقسیم میں دفتری کاروائی کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے، زید کے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ وہ مکان کے اس حصہ کی مرمت وغیرہ کروا سکے۔

کیا اس صورت میں کرایہ سے حاصل شدہ رقم جو زید کے پاس امانت ہے اس سے مکان کی مرمت کروائی جا سکتی ہے؟ اگر مکان کی مرمت نہیں کروائی جاتی تو بوقت فروخت مکان کی پوری قیمت وصول نہ ہوگی۔

نیز یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ اگر اس رقم میں سے مرمت کروائی جا سکتی ہے تو دوسرے ورثہ سے

اس رقم سے خرچ کرنے کی اجازت لینی ضروری ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر مکان و دکان قابل تقسیم ہے تو کسی مشترک رقم خرچ کرنے کے لیے دوسرے شرکاء سے اجازت لینا ضروری نہیں۔

اور اگر مکان قابل تقسیم نہیں یعنی تقسیم کی صورت میں ناقابل انتفاع ہو جاتا ہے تو دوسرے شرکاء سے مرمت پر خرچ کرنے کی اجازت لینا ضروری ہے، اگر وہ اجازت نہ دیں تو حاکم کو درخواست دیکر انہیں مرمت پر مجبور کر سکتے ہیں، اگر حاکم سے اس کی امید نہ ہو تو بدون اجازت شرکاء بھی مرمت پر ان کی رقم خرچ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لانه صار مضطرا الى العمارة كالمشترك الذي لا يقبل القسمة.

قال العلائي رحمه الله تعالى: والضابط ان كل من اجبر ان يفعل مع شريكه اذ فعله احدهما بلا اذن فهو متطوع والا لا، ولا يجبر الشريك على العمارة الا في ثلاث: وصي، وناظر، وضرورة تعذر قسمة ككري نهر ومرمة وقناة وبئر ودولاب وسفينة معيبة وحائط لا يقسم اساسه فلو كان الحائط يحتمل القسمة وبنى كل واحد في نصيبه السترة لم يجبر والا اجبر وكذا كل ما لا يقسم كحمام وحانوت وطاحون ونحوها في متفرقات قضاء البحر والعيني والاشباه.

(رد المحتار: ۳/۵۰۳، ماخوذ از احسن الفتاوی: ۶/۵۰۴)

## مشترک زمین میں بلا اجازت شریک پودے لگا دیے:

سوال: دو آدمی ایک زمین میں شریک ہیں ایک شریک نے کھجور کے پودے مشترک زمین میں لگا دیے۔

چند سال بعد جب پودے پھل دینے لگے تو شریک نے کہا کہ چونکہ میں نے پودے لگائے ہیں اس لئے میں شریک ثانی کو حصہ نہیں دیتا۔

شریک ثانی کہتا ہے کہ چونکہ آپ نے زمین مشترک میں بلا اجازت پودے لگائے ہیں اس لئے یہ پودے بھی تقسیم کئے جائیں گے، اب اس صورت میں کیا فیصلہ ہوگا؟

واضح رہے کہ ہمارے دیار میں یہ عرف ہے کہ کھجور کے پودے لگانے والے کو نصف درخت ملا کرتا ہے لیکن یہ نصف اس وقت ملا کرتا ہے جب مالک زمین کی اجازت صراحتاً یا دلالۃً موجود ہو؟ بینوا توجروا

جواب: یہ زمین دونوں میں تقسیم کی جائے گی، پودے لگانے والے کے حصہ میں اس کے پودے برقرار رہیں گے، اور دوسرے شریک کے حصہ سے پودے لگانے والا اپنے پودے اکھاڑ لے اور پودے اکھاڑنے سے زمین میں جو نقص واقع ہو وہ اس کے مالک کو ادا کرے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: (زرع بينهما زرع احدهما كلها تقسم الارض بينهما فما وقع في نصيبه اقر وما وقع في نصيب شريكه امر بقلعه وضمن نقصان الارض هذا اذا لم يدرك الزرع فلو ادرك او قرب يغرم الزارع لشريكه نقصان نصفه لو انتقصت لانه غاصب في نصيب شريكه. (ردالمحتار: ۳۶۶/۳)

اگر پودے اکھاڑنے سے زمین کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہو تو زمین کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ اپنے حصے میں لگے ہوئے پودوں کی قیمت ادا کر کے ان کا مالک بن جائے، قیمت ایسے پودوں کی لگائی جائے گی جو واجب ہوں اور جن کو اکھاڑنا لازم ہو۔

قال في التنوير: ومن بنى او غرس في ارض غيره بغير اذنه امر بالقلع والرد وللمالك ان يضمن له قيمة بناء او شجر امر بقلعه ان نقصت الارض به.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: (قوله ان نقصت الارض به) اى نقصانا فاحشا بحيث يفسدها اما لو نقصها قليلا فياخذ ارضه ويقلع الاشجار ويضمن النقصان سائحاني عن المقدسي. (ردالمحتار ۱۳۷/۵)

## شرکت میں تعیین نفع کا اصول:

سوال: دو شخصوں نے مل کر ایک کتاب چھاپی، ان میں سے ایک اس کتاب کو فروخت کرتا ہے اور جو کچھ نفع ہوتا ہے اس کا حصہ مساوی یا کم و بیش جیسا کہ طے ہو جائے آپس میں تقسیم

کر لیتے ہیں کیا اس قسم کی شرکت شرعاً جائز ہے؟ بینوا توجروا!

جواب - جائز ہے، البتہ اگر عقد میں یہ ہو کہ کام ایک شریک کے ذمہ مشروط ہو تو دوسرے شریک کے لئے اس کے حصہ راس المال سے زیادہ نفع کی شرط جائز نہیں۔ اگر نفس عقد میں یہ شرط نہ ہو بلکہ تبرعاً کام کر رہا ہو تو کام نہ کرنے والے کیلئے بھی زیادہ نفع کی شرط جائز ہے۔

## کمپنی کی شرعی حیثیت:

کمپنی کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لئے ذیل کا مضمون مولانا عمران اشرف کی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ:

جہاں تک اصل بحث کا تعلق ہے تو اتنی بات تو گذشتہ صفحات میں شرکت اور کمپنی کی تعریفات واقسام اور ان کے درمیان فرق کے بیان میں واضح ہوتی ہے کہ کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں ہے، فقہاء کرام نے شرکت کی پانچ قسمیں ذکر فرمائی ہیں، اگر مضاربت کو اس میں شامل کر لیا جائے تو چھ قسمیں بن جاتی ہیں، کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی تمام و کمال داخل نہیں ہے، لہٰذا کمپنی کا کیا حکم ہے؟ آیا اسے شرکت کی روایتی اقسام میں بظاہر داخل نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیا جائے یا اسے شرکت کی کسی روایتی قسم میں شامل مان کر یا شرکت کی نئی قسم قرار دے کر جائز کہا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلے میں اگر تمام آراء کو جمع کیا جائے تو تین قسم کے نقطہ ہائے نظر بنتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ شرکت شرعاً صرف روایتی پانچ قسموں یعنی شرکت الاموال، شرکت الاعمال، شرکت الوجوہ، شرکت المفاوضہ، شرکت العنان میں منحصر ہے، اور اگر مضاربت کو بھی اس میں داخل مانا جائے تو چھ قسمیں ہو جاتی ہیں اور کمپنی ان مذکورہ اقسام میں سے کسی میں بھی تمام و کمال داخل نہیں ہے لہٰذا یہ ناجائز ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ کمپنی ان قسموں میں داخل نہیں ہے اسے ناجائز نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر فرمائی ہیں وہ منصوص نہیں ہیں۔ بلکہ فقہائے کرام نے اپنے دور میں شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے اس کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے۔

اور پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ جو صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو وہ ناجائز ہوگی لہذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی شرکت کی کسی ایک قسم میں داخل ہے، پھر اس میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ شرکت عنان میں داخل ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ مضاربہ کی ایک شکل ہے۔

اب ذیل میں مذکورہ بالا تینوں نقطہ نظر علیحدہ علیحدہ دلائل کے ساتھ ذکر کئے جاتے ہیں

## پہلا نقطہ نظر:

کمپنی کے عقد کے بارے میں پہلا نقطہ نظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ شرکت شرعی لحاظ سے صرف روایتی پانچ قسموں یعنی شرکت الاموال، شرکت الاعمال، شرکت الوجوہ، شرکت المفاوضہ، شرکت العنان، میں منحصر ہے، اور اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل مانا جائے تو چھ قسمیں بن جاتی ہیں، جبکہ کمپنی کا عقد مذکورہ بالا کسی قسم پر پورا نہیں اترتا، لہذا یہ ناجائز ہے، یہ نظریہ شیخ تقی الدین النبہانی کا ہے، ان کی رائے کے مطابق کمپنی کا عقد شرکت کی کسی بھی روایتی یا معروف اقسام میں داخل نہیں ہے، بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا پیدا کردہ ایک کاروباری طریقہ ہے، لہذا اسے اسلامی شرکت کے کسی طریقے پر منطبق کر کے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔[1]

ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ کی رائے بھی کسی حد تک ان کے مماثل ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں

لا نعلم ان الفقه الاسلامي يعترف بهذا النوع من الشركات.

یعنی ہمارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ اسلامی فقہ شرکت (کمپنی) کی اس قسم کا اعتراف اور اعتبار کرتی ہو۔[2]

ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ نے اگرچہ صراحتاً اسے حرام تو نہیں کہا ہے البتہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اسلام میں کسی نے اسے حلال قرار دیا ہے، اور بعض وجوہ کی بنا پر یہ شرکات کی معروف اقسام پر منطبق بھی نہیں ہو سکتی۔[3]

---

(1) [illegible]

(2) [illegible]

(3) [illegible]

گویا کہ شیخ تقی الدین النبہانی اور ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ دونوں اس بارے میں متفق ہیں کہ اسے شرکت کی کسی روایتی قسم پر منطبق نہیں کیا جا سکتا، ان کے دلائل ذیل میں ذکر کئے گئے ہیں

1. کمپنی میں دو یا زائد افراد کے درمیان اس قسم کا کوئی عقد نہیں پایا جاتا جو شرکت میں ضروری سمجھا جاتا ہے، کیونکہ عقد دو افراد کے درمیان ایجاب و قبول کا نام ہے، شرکت کے روایتی تصور میں یہ ہے کہ شرکاء کے درمیان ایجاب و قبول پایا جانا ضروری ہے، اس کے برعکس کمپنی میں جو شخص شرکت کرنا چاہتا ہے وہ شخص اپنے ادارے سے جا کر شیئر خرید لیتا ہے خواہ بقیہ شرکاء (شیئر ہولڈرز) کی رضامندی اور قبول پایا جائے یا نہ پایا جائے۔[1]

2. شرکت کے روایتی تصور میں دو یا زیادہ شرکاء اس بات پر اتفاق کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے مشترک سرمایہ سے تجارت کریں گے، یہ بات کمپنی میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اس میں حصہ دار (Sheare Holder) صرف اپنا سرمایہ لگاتے ہیں، کاروبار کا مکمل کمپنی یا اس کے ملازمین سر انجام دیتے ہیں، ہر شریک کو کاروبار میں دخل اندازی کا اختیار بھی نہیں ہوتا، یہ بات بھی شرکت کے روایتی تصور کے خلاف ہے۔[2]

3. روایتی شرکت کے جواز کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شرکت کے ذریعہ کاروبار کرنے والا کوئی ایسا بدن انسانی ہو جو قولی اور فعلی تصرفات کی اہلیت رکھتا ہو، اس کے برعکس کمپنی میں شرکاء کی طرف سے کاروبار کرنے والا ایک شخص قانونی یا شخص حکمی (Juristic Person) ہوتا ہے جو کاروبار کی تمام ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، اس شخص قانونی کی کوئی نظیر فقہ کی قدیم کتابوں میں نہیں ملتی۔

4. کمپنی کی ایک خصوصیت محدود ذمہ داری (Limited Liability) ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حاملان حصص (Share Holders) کی ذمہ داریاں ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کی حد تک محدود ہوتی ہے، یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ نقصان یہ ہوگا

---

(1) الخیاط، الشیخ عبد العزیز، الشرکات فی الفقه الإسلامی [illegible] الشریعة الإسلامیة والقانون الوضعی، دار النهضة العربیة بیروت [illegible]

(2) الخیاط، الشیخ عبد العزیز، الشرکات فی الفقه الإسلامی [illegible] الشریعة الإسلامیة والقانون الوضعی، دار النهضة العربیة بیروت [illegible]

الخیاط، الشیخ عبد العزیز، الشرکات فی الفقه الإسلامی [illegible] الشریعة الإسلامیة والقانون الوضعی، دار النهضة العربیة بیروت [illegible]

کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا، اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہو گیا تو حاملین حصص سے ان کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا، محدود ذمہ داری کے اس تصور کی روایتی فقہ دور شرکت میں نظیر و مماثلت نہیں ملتی، یہ بات بھی شرکت کے جواز کے لیے مانع ہے۔

۵۔ روایتی شرکت میں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی شریک مر جائے یا پاگل ہو جائے یا اسے زبانی اور عملی تصرفات سے روک دیا جائے (یعنی فقہی اصطلاح کے مطابق اسے محجور کر دیا جائے) یا کوئی شریک عقد شرکت فسخ کر دے تو پوری عقد شرکت فسخ ہو جاتی ہے، اس کے برعکس کمپنی میں کسی بھی شریک کی طرف سے ان حالات میں کمپنی کا کاروبار فسخ یا ختم نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے، یہ بھی شرکت کے روایتی تصور کے خلاف ہے۔[1]

## دوسرا نقطہ نظر:

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ کمپنی شرکت کی روایتی اقسام میں داخل نہیں ہے اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر فرمائی ہیں وہ منصوص نہیں ہیں، بلکہ فقہاء کرام نے شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے ان کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے، پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ جو صورت ان اقسام میں داخل نہیں ہے وہ ناجائز ہوگی، لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی، یہ نقطہ نظر موجودہ علماء کی بھاری اکثریت کا ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ کمپنیوں وغیرہ شرکت کی تمام جدید صورتیں جائز ہیں، بشرطیکہ سود سے پاک ہوں۔

## تیسرا نقطہ نظر:

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی شرکت کی کسی قسم میں داخل ہے، پھر اس میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ شرکت عنان میں داخل ہے، یہ رائے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ[2] اور موجودہ دور کے اکثر علماء عرب اور عجم جیسے ڈاکٹر عبدالعزیز خیاط[3] اور الاستاذ علی الخفیف[4] اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم وغیرہ کی ہے۔[5]

---

(1) الخیاط، عبدالعزیز [illegible] الشرکات [illegible] [illegible]
(2) تھانوی، مولانا اشرف علی، امداد الفتاویٰ، مکتبہ دارالعلوم کراچی [illegible]
(3) الخیاط، عبدالعزیز [illegible] الشریعۃ الاسلامیۃ [illegible]
(4) الخفیف، علی [illegible]
(5) عثمانی، مولانا محمد تقی [illegible] کراچی [illegible]

بعض حضرات کا خیال ہے کہ کمپنی کا عقد مضاربت کی ایک شکل ہے یہ رائے شیخ عبد الوہاب کی ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ کمپنی مضاربت کے عقد کی مانند ہے جس میں ایک فریق کا سرمایہ ہوتا ہے جیسے رب المال اور دوسرے فریق کا عمل جسے مضارب یا عامل کہتے ہیں اور کمپنی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک فریق کا سرمایہ اور دوسرے فریق کا عمل تجارت ہوتا ہے لہٰذا یہ مضاربت میں داخل ہے۔[1]

## قابلِ ترجیح رائے:

مذکورہ بالا تمام اقوال اور آراء میں سب سے زیادہ ترجیح حضرت تھانویؒ کی رائے کو ہونی چاہیے کہ کمپنی کا عقد شرکت عنان میں داخل ہے، کیوں کہ اس میں کمپنی قائم کرنے والے افراد بھی دوسرے شرکاء (Share Holders) کی مانند کمپنی میں حصہ دار ہوتے ہیں، لہٰذا تمام افراد کمپنی میں شریک ہو جاتے ہیں، البتہ کمپنی قائم کرنے والے لوگ اپنے جو ملا ثوں اور عروض (اجناس) اور مال تجارت کو (قیمت لگا کر) نقدی میں تبدیل کر لیتے ہیں، مثلاً ان لوگوں نے دس ہزار روپے کمپنی قائم کرنے کے لئے جائداد مثلاً عمارتوں اور ساز و سامان پر صرف کیے تو اگر سو روپے کا ایک حصہ (Share) ہے تو وہ خود کو سو حصوں کا حصہ دار ظاہر کریں گے، البتہ اس صورت میں کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے شرکت صرف نقد سرمایہ سے نہیں ہوگی، بلکہ شرکت بالعروض ہوگی، جس کے بارے میں اسی باب کے پہلے عنوان "کیا سرمائے کا نقد ہونا ضروری ہے" کے تحت اختلاف مذاہب بیان ہو چکے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر عروض ذوات الامثال میں سے ہوں تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے[2] اور احناف کے نزدیک اگر دو معروض ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیے جائیں تو جائز ہیں[3] حضرت تھانویؒ اور دیگر علماء کرام فرماتے ہیں کہ لوگوں کی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر مالکیہ کے قول پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہے۔[4]

خلاصہ یہ کہ اسے شرکت عنان قرار دیا جا سکتا ہے اور اس میں سرمایہ لگانے والے آپس میں

---

(1) [illegible]

(2) [illegible]

(3) الکاسانی، علاء الدین، ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع [illegible]

(4) تھانوی، مولانا اشرف علی تھانوی، امداد الفتاویٰ [illegible]

شرکاء بھی ادارے میں شرکت عنان کی مانند بعض شرکاء کے حصص زیادہ اور بعض کے کم ہوتے ہیں۔
جو حضرات اسے یہ کہہ کر مضاربہ قرار دیتے ہیں کہ اس میں مضاربہ کی طرح ایک فریق کا سرمایہ اور
دوسرے فریق کا عمل تجارت ہوتا ہے، اسی وجہ سے یہ مضاربہ ہے، ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے،
کیونکہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں شرکت نہیں ہوتی، بلکہ حصہ داروں کی تعداد بعض اوقات
ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے اور تمام حصہ داروں کا بذات خود اس میں حصہ لینا تو ممکن ہے اور نہ ہی
سب اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، بلکہ وہ تمام حصہ داران میں انتخاب کر کے ایک مجلس ادارات
قائم کر لیتے ہیں، جس کی حیثیت ان شرکاء کے وکیل کی مانند ہوتی ہے، پھر مجلس ادارات سے منتخب
کر کے ایک شخص کو ناظم (مدیر) (Managing Director) بنایا جاتا ہے، جو تمام تصرفات
انجام دیتا ہے، لہذا حقیقت یہ ہے کہ تصرفات انجام دینے میں بھی تمام شرکاء کی حصہ داری ہوتی
ہے لہذا یہ شرکت عنان ہے۔

## کمپنی کو ناجائز قرار دینے والوں کے دلائل کا جائزہ:

اب ہم سب سے پہلے ذکر کردہ نقطہ نظر رکھنے والے حضرات کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جو
کمپنی کے عقد کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں۔

۱- مطلقاً ناجائز کہنے والوں کی سب سے پہلی دلیل یہ تھی کہ کمپنی میں دو یا زیادہ افراد
کے درمیان شرکت کا عقد کرنے کے لئے ایجاب و قبول نہیں پایا جاتا، حالانکہ کوئی بھی عقد ایجاب
و قبول کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ دلیل صحیح نہیں کیونکہ کمپنی قائم کرنے کا ارادہ سب سے پہلے کسی
ایک فرد کے ذہن میں آتا ہے، پھر وہ دوسروں کو اپنے ساتھ شرکت کی دعوت دیتا ہے تو پہلے شخص کی
طرف سے ایجاب پایا گیا، اور اس کے ساتھ اس کی دعوت پر شرکت قبول کرنے والوں کی طرف
سے قبول پایا گیا، اس طرح کمپنی میں ایجاب و قبول کے ساتھ ان معنوں میں عقد شرکت پایا گیا، اور
شرکاء نے یہ طے کیا کہ وہ نفع نقصان میں شریک ہوں گے، اور اس عقد کے بانی شرکاء اس کے لئے
مخصوص تحریریں تیار کرتے ہیں، مثلاً میمورنڈم اور آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن، نیز ایک مختصر
مرتب کرتے ہیں، جسے پراسپیکٹس (Prospectus) کہا جاتا ہے، یہ تمام مسودات اس عقد کے
ایک قسم کے تحریری ثبوت ہوتے ہیں، لہذا یہ بات ٹھیک نہیں، پھر جو لوگ کمپنی قائم ہونے کے بعد

بازار سے شیئرز خریدتے ہیں، وہ بیچنے والے کے ساتھ ایجاب وقبول کرتے ہیں کہ ایجاب وقبول پایا جاتا ہے، کیونکہ کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے ایجاب ہوا اور بعد میں شریک ہونے والوں کی طرف سے قبول پایا گیا۔

2- مطلق حرام کہنے والے حضرات کی دوسری دلیل یہ تھی کہ شرکت کے روایتی تصور میں یہ ہے کہ دو یا زیادہ شرکاء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ وہ اپنے مشترک سرمایہ سے مل کر تجارت کریں گے، یہ بات کمپنی میں نہیں پائی جاتی، کیوں کہ اس میں حصہ دار (Share Holders) صرف اپنا سرمایہ لگاتے ہیں، کاروبار کا عمل کمپنی یا اس کے ملازمین سرانجام دیتے ہیں، ہر شریک کو کاروبار میں دخل اندازی کا اختیار نہیں ہوتا، یہ باتیں شرکت کے خلاف ہیں۔

ان حضرات کی یہ دلیل بھی صحیح نہیں کیوں کہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں شرکت نہیں ہوتی، بلکہ حصہ داروں کے عمل میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے، اور وہ اس طرح کہ کمپنی میں حصہ داروں کی تعداد بعض اوقات ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے، اور تمام حصہ داران کا بذات خود کام میں حصہ لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی وہ تمام اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، بلکہ وہ تمام حصہ داران مل: انتخاب کر کے ایک مجلس ادارت قائم کر دیتے ہیں، جس کی حیثیت ان شرکاء کے وکیل کی ہوتی ہے اور پھر مجلس ادارت سے منتخب کر کے ایک شخص کو مدیر بنایا جاتا ہے جو تمام تصرفات انجام دیتا ہے، لہذا امر واقعہ یہ ہے کہ تصرفات انجام دینے والا شخص تمام حصہ داران کا نمائندہ یا ملازم ہوتا ہے، لہذا اس کا ہر فعل حصہ داروں کا فعل ہے اور انہیں اسے ہر قسم کے اعتراض اور نگرانی کا اختیار ہوتا ہے، اور انتخاب میں رائے دہی کا حق ان کے حصص کے تناسب سے ہوتا ہے، یہ طریقہ شرکت یا کمپنی کی مصالح کے عین موافق ہے، اس لئے کہ کمپنی کا سب سے زیادہ خیر خواہ وہی ہو سکتا ہے، جس کا سرمایہ کمپنی میں زیادہ لگا ہوا ہو، لہذا کمپنی کو مطلق حرام کہنے والوں کا یہ دعوی بالکل بے جا ہے کہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں اشتراک پایا جاتا ہے، عمل میں اشتراک نہیں پایا جاتا، اور شرکاء کو کمپنی میں کسی قسم کے عمل دخل کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔[1]

3- جو حضرات کمپنی کے مطلق ناجائز ہونے کے قائل ہیں ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ دونوں شرکت کیلئے یہ ضروری ہے کہ شرکت کے ذریعہ کاروبار کرنے والا کوئی ایسا بدنی انسان ہو

(1) [illegible]

جو تصرفات قولیہ اور تصرفات فعلیہ کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کے برعکس کمپنی میں شرکاء کی طرف سے کاروبار کرنے والا ایک شخص قانونی یا شخص حکمی ہوتا ہے، جو کاروبار کی تمام ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، اس شخص قانونی کی فقہ میں کوئی نظیر نہیں۔

جیسا کہ ہم نے دوسری دلیل کے جواب میں ذکر کیا کہ تصرفات قولیہ وفعلیہ کا اختیار مجلس ادارت کو ہوتا ہے جو شرکاء کی وکیل ہے، لہٰذا کاروبار درحقیقت تمام حصہ داران اپنے وکیل کے واسطے سے انجام دیتے ہیں، البتہ متعدد قانونی وجوہات کی بناء پر ان شرکاء کے مجموعے کو "شخص قانونی" (juristic Person) کی حیثیت دے دی گئی ہے، اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ "شخص قانونی" کا تصور اسلام میں موجود ہے یا نہیں؟ جائزہ لینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں اگرچہ شخص قانونی کی اصطلاح موجود نہیں ہے، لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

# شخص قانونی کے فقہی نظائر

## (۱) وقف:

وقف کے لئے اگرچہ شخص قانونی (Juristic Person) کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی، مگر حقیقت میں یہ ایک شخص قانونی ہے۔ اس لئے وقف اشیاء کا مالک بن سکتا ہے، کیونکہ جب کوئی شخص کسی چیز کو وقف کرتا ہے تو وقف کردہ چیز جمہور فقہاء کے نزدیک واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور جس کے اوپر وقف کیا گیا (جسے موقوف علیہ کہا جاتا ہے) اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ چیز نہ واقف (وقف کرنے والا) کی ملکیت ہوتی ہے اور نہ ہی موقوف علیہ کی ملک ہوتی ہے، بلکہ وقف خود ایک مستقل وجود رکھتا ہے، گویا کہ اب وہ ایک شخص قانونی کی شکل اختیار کر گیا ہے، لہٰذا اب وہ اشیاء کا مالک بھی بن سکتا ہے، وہ دائن اور مدیون یا مؤجر اور مستاجر بھی بن سکتا ہے، چنانچہ وقف کا متولی اس کی طرف سے کوئی قرضہ لے سکتا ہے، یا کوئی چیز کرایہ پر لے سکتا ہے، اسی طرح اس کے لئے ضرورت کی کوئی چیز خرید سکتا ہے، اور اس قرضہ یا واجب الاداء کرایہ کی رقم یا قیمت کی ادائیگی کا وجوب درحقیقت وقف پر ہوگا، لہٰذا متولی وقف کی آمدنی سے ان کی ادائیگی کرے گا، اسی طرح وقف کی جائیدادیں کرایہ پر بھی دی جاسکتی ہیں اور ان کے کرایہ کا مستحق وقف ہوگا، اگر وقف کے متولی نے وقف کے لئے اسٹور بنایا پھر وہ معزول ہوگیا تو اس سے

عوض کا مطالبہ نہیں ہوگا، بلکہ نیا متولی وقف کی طرف سے اسی کی آمدنی سے اس زمین کی ادائیگی کرے گا، بلاوقف جھگڑوں اور مقدمات کی صورت میں دراصل وقف ہی مدعی یا مدعی علیہ ہوگا، اور اس کی طرف سے متولی اس کے متعلقہ امور نمٹائے گا۔[19]

## (۲) بیت المال:

بیت المال سے پوری قوم کا حق تو متعلق ہے مگر ہر شخص اس مال میں ملک کا دعویٰ نہیں کر سکتا اس مال کا مالک بیت المال ہی ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال بھی ایک شخص قانونی ہے، بلکہ فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کی ہر ایک مد ایک مستقل شخص قانونی ہے، بیت المال کے دو الگ الگ حصے ہیں، بیت مال الصدقہ، بیت مال الخراج، امام زیلعی رحمہ اللہ نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ایک حصہ میں مال نہ ہو تو بوقت ضرورت دوسرے حصے سے قرض لیا جا سکتا ہے۔

(تبیین الحقائق کتاب السیر فصل باب العشر ۲۸۴/۳)

اس صورت میں جس حصے سے قرض لیا گیا وہ دائن اور جس حصے کے لئے قرض لیا گیا وہ مدیون ہوگا، دائن یا مدیون تو شخص ہوا کرتا ہے، تو معلوم ہوا کہ بیت المال کو بھی شخص فرض کر لیا گیا ہے۔

## (۳) ترکۂ مستغرقہ بالدین:

کسی میت کا سارا ترکہ دیون سے مستغرق ہو تو اس صورت میں دائنین کا مدیون نہ میت ہے اس لئے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص مدیون نہیں ہوتا اور نہ ورثہ مدیون ہیں، اس لئے کہ ان کو تو میراث ملی ہی نہیں، لہٰذا یہاں مدیون ترکہ ہوگا جو شخص قانونی ہے۔

## (۴) خلطۃ الشیوع:

یہ نظریہ حنفیہ کے مذہب کے مطابق نہیں، بلکہ ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق ہے، ان کے ہاں مال زکوٰۃ کئی شخصوں میں مشاع طور پر مشترک ہو تو زکوٰۃ انفرادی حصوں پر نہیں، بلکہ مجموعے پر [illegible] ائمہ ثلاثہ کے ہاں مجموعہ ایک شخص قانونی ہے، یہاں یہ بات یاد رکھنے کے

[illegible]

قائل ہے کہ شرکۃ الشیوع اور کمپنی کے نظام میں یہ فرق ہے کہ شرکۃ الشیوع میں اثاثہ جات کے پول مجموعے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، پھر ہر شریک کی انفرادی حیثیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اور کمپنی کے نظام میں کمپنی پر الگ ٹیکس ہوتا ہے اور شیئر ہولڈرز پر الگ ٹیکس ہوتا۔

ان نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص قانونی کا تصور فقہ کے لئے کوئی ناجائز تصور نہیں ہے، اور نہ فقہ اسلامی کے لئے کوئی اجنبی تصور ہے، البتہ یہ اصطلاح نئی ضرور ہے۔

## محدود ذمہ داری کی شرعی حیثیت

کمپنی کی دوسری خصوصیت جو شرعی اعتبار سے قابل غور ہے، وہ (Limited Liability) یعنی "محدود ذمہ داری" ہے جس کی تشریح پیچھے کی جاچکی ہے۔ اس میں جہاں تک شیئر ہولڈرز کی محدود ذمہ داری کا تعلق ہے، اس کی تو شرعی نقطۂ نظر سے ایک نظیر موجود ہے۔ اس لئے کہ جب تک رب المال مضارب کو دوسروں سے قرض لینے کی اجازت نہ دے، مضاربت میں رب المال کی ذمہ داری اس کے سرمائے تک محدود ہوتی ہے، چنانچہ اگر رب المال نے مضارب کو سرمایہ دیا اور مزید قرض لینے کی اجازت نہیں دی، پھر کاروبار کے نتیجے میں مضارب پر دیون واجب ہوگئے تو ایسی صورت میں رب المال کا زیادہ سے زیادہ اس کے سرمائے کی حد تک نقصان ہوگا، اس سے زیادہ کا رب المال سے مطالبہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے زیادہ کا ذمہ دار مضارب ہوگا کیونکہ اس نے رب المال کی اجازت کے بغیر قرضے لئے ہیں، اس لئے وہی ان کا ذمہ دار ہے، ایسے ہی شیئر ہولڈرز جو خود عمل نہ کر رہا ہو تو اس کی ذمہ داری محدود ہونے کی شرط مضاربت کے اصول پر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ البتہ یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تقریباً تمام کمپنیوں کے پراسپکٹس میں یہ بات درج ہے کہ کمپنی ضرورت کے مواقع پر بینکوں وغیرہ سے قرض لے سکے گی، اور جو لوگ کمپنی کے شیئر ہولڈرز بنتے ہیں ان کو یہ بات معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جب وہ پراسپکٹس کو دیکھ کر کمپنی کے حصہ دار بنتے ہیں تو ان کی طرف سے گویا معنوی اجازت ہے کہ کاروبار کے لئے قرض لیا جاسکتا ہے، اور جب رب المال مضارب کو قرض کی اجازت دیدے تو اس کی ذمہ داری محدود نہیں رہتی۔ لیکن اس شبہ کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ پراسپکٹس ہی میں یہ بات بھی درج ہوتی ہے کہ شیئر ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ حصہ داروں کی طرف سے کمپنی کو قرض لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم پر ان قرضوں کی ذمہ داری لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ نہ ہوگی لہٰذا اس کی صحیح نظیر

یہ ہے کہ رب المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی اجازت دے کہ اس کی ذمہ داری وہ خود برداشت کرے۔

لیکن یہاں شرعی نقطۂ نظر سے اصل اشکال یہ ہے کہ مضاربت میں رب المال کی ذمہ داری تو محدود ہوتی ہے مگر مضارب کی ذمہ داری تو محدود نہیں ہوتی، لہٰذا دائنین رب المال کے سرمائے سے زائد دیون مضارب سے وصول کر سکتے ہیں، چنانچہ دائنین کا ذمہ خراب نہیں ہوتا، لیکن کمپنی میں ڈائریکٹران کی ذمہ داری بھی محدود ہے اور خود کمپنی جو شخص قانونی ہے اس کی ذمہ داری بھی محدود ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کے اثاثوں سے زائد دائنین کا جو دین ہوگا اس کی وصولیابی کی کوئی صورت نہیں رہے گی اور دائنین کا ذمہ خراب ہو جائے گا "خراب الذمۃ" فقہاء کی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دائن کا دین ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہے۔

اسی اشکال کی بناء پر بعض علماء عصر کی رائے یہ ہے کہ محدود ذمہ داری کا تصور شرعاً صحیح نہیں، اس لئے کہ اس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہو جاتے ہیں، کم از کم ڈائریکٹران کی ذمہ داری غیر محدود ہونی چاہئے، لیکن اس مسئلے کو اگر ایک دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کمپنی کی محدود ذمہ داری کے تصور کی بنیاد درحقیقت شخص قانونی کے تصور پر ہے، شخص قانونی کو حقیقت ماننے کے بعد محدود ذمہ داری کو ماننا مشکل نہیں رہتا، شخص حقیقی مفلس (دیوالیہ) ہو جائے تو دائنین صرف اس کے اثاثوں سے دین وصول کر سکتے ہیں، اس سے مزید کا مطالبہ نہیں کر سکتے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی تفلیس فرمانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے دائنین کو فرمایا تھا "خذوا ما وجدتم وليس لكم إلا ذلك"[1] البتہ اگر وہ دوبارہ غنی ہو جائے تو اب پھر مطالبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر مفلس ہونے کی حالت میں اس کی موت واقع ہو جائے تو "خراب الذمۃ" ہو جاتا ہے اور اس کے دیون ادا ہونے کی کوئی صورت نہیں رہتی، معلوم ہوا کہ شخص حقیقی اگر مفلس ہو کر مر جائے تو اس کی ذمہ داری اثاثوں تک محدود ہوتی ہے اور دائنین کا ذمہ خراب ہو جاتا ہے، جب کمپنی کو بھی شخص مان لیا گیا ہے تو یہ بھی اگر دیوالیہ ہو کر تحلیل ہو جائے تو اس کی ذمہ داری بھی اثاثوں تک محدود ہونی چاہئے، اس لئے کہ کمپنی کا تحلیل ہو جانا ہی اس شخص قانونی کی موت ہے۔

خصوصاً جب کہ کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے والا یہ دیکھ کر معاملہ کرتا ہے کہ یہ کمپنی لمیٹڈ ہے،

---

(۱) [illegible] ۱۵۵۶ [illegible]

# کتاب القسمة

مشترک ملک کی تقسیم شرعاً جائز ہے، البتہ جو چیز بعد تقسیم قابل انتفاع نہ رہے اس کی تقسیم کے لئے شرکاء کی رضامندی ضروری ہے، محض ایک شریک کی چاہت و مطالبہ پر قاضی تقسیم نہیں کرے گا، ہاں دونوں ہی تقسیم کے خواہشمند ہوں تو تقسیم کر دی جائے گی یا یہ کہ تقسیم کے بجائے اپنے شریک کے ہاتھ فروخت کر دے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالى: القسمة في الأعيان المشتركة مشروعة لأن النبي عليه الصلاة والسلام باشرها في المغانم والمواريث وجرى التوارث بها من غير نكير. (هداية: ٤/٤١١)

وشرطها عدم فوت المنفعة بالقسمة ولذا لا يقسم نحو حائط وحمام (درمختار) وقال الشارح تحت قوله المنفعة أي المعهودة وهي ما كانت قبل القسمة فإذا انعدم بعدها ينتفع به كحطب وربط الدواب، وسيذكره الشارح عن المجتبى. وقوله ولذا لا يقسم نحو حائط: يعني عند عدم الرضا من الجميع أما إذا رضي الجميع صحت كما سيأتي متنا اهـ. (ردالمحتار: ٦/٢٥١، كتاب القسمة)

## بوقت تقسیم شرکاء کے موجود ہونے کی تفصیل:

مشترک اشیاء کی تقسیم کے وقت تمام شرکاء کا موجود ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر شئی مشترک ذوات الامثال میں سے ہو تو تمام شرکاء کا موجود ہونا ضروری نہیں، خواہ یہ چیز وراثت سے حاصل ہوئی ہو یا مشترک خریداری وغیرہ سے۔

البتہ شریک غائب کا حصہ اس تک پہنچنے سے پہلے اگر ضائع ہو جائے تو نقصان حاضر و غائب دونوں کو برداشت کرنا ہوگا، پھر حاضر کو ملا ہوا حصہ دونوں میں مشترک ہوگا۔

اور اگر شئی مشترک ذوات القیم میں سے ہے تو سب شرکاء کا موجود ہونا ضروری ہے، کوئی شریک غائب ہو تو تقسیم صحیح نہیں، بلکہ غائب کی اجازت پر موقوف ہے، البتہ صرف ترکہ کی تقسیم ہو تو اذن قاضی جائز ہے، قاضی غائب شریک کی طرف سے اس کا حصہ قبضہ کرنے کے لئے نائب مقرر

کرے۔

قال في التنوير وشرحه: (وتشتمل) مطلقا (على) معنى (الإفراز) وهو أخذ عين حقه (و) على معنى (المبادلة) وهو أخذ عوض حقه (و) الإفراز (هو الغالب في المثلي) وما في حكمه وهو العددي المتقارب فإن معنى الإفراز غالب فيه أيضا ابن كمال عن الكافي (والمبادلة) غالبة (في غيره) أي غير المثلي وهو القيمي إذا تقرر هذا الأصل (فيأخذ الشريك حصة غيبة صاحبه في الأول) أي المثلي لعدم التفاوت (لا الثاني) أي القيمي لتفاوته.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: (قوله والإفراز هو الغالب في المثلي) لأن ما يأخذه أحدهما نصفه ملكه حقيقة ونصفه الآخر بدل النصف الذي بيد الآخر فباعتبار الأول إفراز وباعتبار الثاني مبادلة إلا أن المثلي إذا أخذ بعضه بدل بعض كان المأخوذ عين المأخوذ عنه حكما لوجود المماثلة بخلاف القيمي.

(قوله وما في حكمه) أي حكم المثلي قال نقل في جامع الفصولين عن شرح الطحاوي كل كيلي ووزني غير مصوغ وعددي متقارب كفلوس وبيض وجوز ونحوها مثليات والحيوانات والذرعيات والعددي المتفاوت كرمان وسفرجل والوزني الذي في تبعيضه ضرر وهو المصوغ قيميات. اهـ. ثم نقل عن الجامع العددي المتقارب كله مثلي كيلا وعددا ووزنا وعند زفر رحمه الله تعالى قيمي وما تتفاوت آحاده في القيمة فعددي متفاوت ليس بمثلي اهـ فتأمل. (رد المحتار: ٥/١٧٨)

قال في شرح التنوير: في التتارخانية مكيل أو موزون بين حاضر وغائب أو بالغ وصغير فأخذ الحاضر أو البالغ نصيبه نفذت القسمة إن سلم حظ الآخر وإلا لا.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: (قوله في الخلاصة الخ) اراد به بيان فائدة هي انه اذا قسم الوكيل حصته بغيبة صاحبه كما قال في المتن لا تنفذ القسمة حتى تسلم حصة الآخر (قوله الى ان تسلم حصة الآخرين) اى الغائب والصغير ومفهومه ان سلامة ما اخذه لا تشترط كما سيظهر (قوله والا لا) اى وان لم تسلم بأن هلكت قبل وصولها اليهما لا تنفذ القسمة بل تنتقض ويكون الهالك على الكل ويشترك الآخران فيما اخذ لما في عقد القسمة من معنى المبادلة.

(رد المحتار: ٥/١٧٨)

قال في شرح التنوير: وصحت برضاء الشركاء الا اذا كان فيهم صغير او مجنون لا نائب عنه او غائب لا وكيل عنه لعدم لزومها حينئذ الا باجازة القاضي او الغائب او الصبي اذا بلغ او وليه هذا لو ورثة ولو شركاء بطلت ببيع المعتق وغيرها. (رد المحتار: ٥/١٨٠)

وفيه ايضا بعد صفحتين: (ولو برهنا على الموت وعدد الورثة وهو) اى العقار نفسه قال شيخنا وكذا المنقول بالاولى (معهما وفيهم صغير او غائب قسم بينهم ونصب قابض لهما) لحظ الغائب والصغير ولا بد من البينة على اصل الميراث عنده ايضا خلافا لهما كما مر (فان برهن) وارث (واحد) لا يقسم اذ لا بد من حضور اثنين ولو احدهما صغيرا او موصى له (او كانوا) اى الشركاء (مشترين) اى شركاء بغير الارث (وغاب احدهم) لان في الشراء لا يصلح الحاضر خصما عن الغائب بخلاف الارث.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: (قوله قسم بينهم) افاد ان القاضي فعل ذلك قال في المحيط فلو قسم بغير قضاء لم تجز الا ان يحضر او يبلغ فيجيز طوري وهذا ما قدمه الشارح (قوله بخلاف الارث) قال في المعراج لان ملك الوارث ملك خلافة حتى

2. باہم مکانوں کی تعیین کرلیں یعنی ایک مکان ایک شریک کے لئے دوسرا دوسرے شریک کے لئے، پھر ہر شریک کو اختیار ہے کہ اپنے متعین مکان میں خود رہے یا کرایہ وغیرہ پر دے کر منافع حاصل کرے۔ اس صورت میں ہر ایک اسی مکان کے منافع کا مستحق ہوگا جو اس کو تقسیم میں ملا ہے خواہ اس کا منافع دوسرے سے کم ہو یا زیادہ۔

قال الإمام التمرتاشي رحمه الله تعالى: ولو تهايآ في سكنى دار أو دارين (إلى قوله) أو في غلة دار أو دارين صح.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: تنبيه: في الهداية ولكل واحد أن يستغل ما أصابه بالمهايأة وإن لم يشترط ذلك لحدوث المنافع على ملكه.

قوله كذلك أي بأن يأخذ هذا شهرا والآخر شهرا أو يأخذ هذا غلة هذه والآخر غلة الأخرى (رد المحتار: ۶/۲۶۹، آخر كتاب القسمة)

# وکالت کے احکام

## وکالت کا معنی لغت میں:

التفويض والاعتماد على الغير

یعنی لغت میں وکالت کا معنی ہے، سپرد کرنا، دوسرے پر اعتماد کرنا، کسی کو اپنے کاموں کے انجام دہی کے لئے نائب مقرر کرنا۔

قال الله تعالى: ﴿إني توكلت على الله ربي وربكم﴾

(سورة هود: ۵۶)

## الوكالة في الشرع:

إنابة الشخص لآخر فيما يقبل النيابة وتفويض أمره إليه بما يحقق الخير والمصلحة وباختصار تفويض شخص أمره لآخر فيما يقبل النيابة.

یعنی شرعاً وکالت کا معنی یہ ہے کہ جس میں نیابت جاری ہو سکتی ہو اور وہ کام دوسرے کے سپرد

کرنے میں خیر و مصلحت ہو جیسے کام انجام دینے کے لئے کسی کو اپنا نائب مقرر کرے۔

## وکالت کی مشروعیت:

چونکہ ہر انسان اپنا ہر کام خود انجام دینے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے ذریعے کام کرانے پر مجبور ہوتا ہے، اس لئے شرعاً وکالت جائز کاموں کو انجام دینے کے لئے جائز ہے، دوسروں کے کام انجام دینا یہ نیکی کے کام میں تعاون ہے۔

لقوله تعالى: ﴿تعاونوا على البر والتقوى، ولا تعاونوا على الاثم والعدوان﴾ (سورة المائدة : ۲)

یعنی نیکی و تقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، گناہ اور ظلم کے کام میں ایک دوسرے کی مدد مت کرو۔

لقوله عليه السلام: "والله في عون العبد ما كان العبد في عون اخيه." (طرف من حديث اخرجه البخاري ومسلم)

یعنی جب کوئی آدمی کسی کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس آدمی کی مدد کرتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ حکیم بن حزام کو قربانی کا جانور خریدنے کے لئے وکیل مقرر فرمایا تھا، اسی طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حج کے موسم میں تبلیغ سورت کے لئے اپنا نائب مقرر فرمایا تھا، اسی طرح بعض صحابۂ کرام کو زکوۃ وصول کرنے کے لئے اپنا نائب مقرر کر کے مختلف علاقوں کی طرف بھیجنا ثابت ہے، اسی طرح اقامت حدود کے لئے بعض صحابہ کو مقرر فرمانا بھی احادیث سے ثابت ہے۔

والاصل فيه قوله سبحانه تعالى: ﴿وان خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من اهله وحكما من اهلها ان يريدا اصلاحا يوفق الله بينهما﴾ (سورة النساء : ۳۵)

اگر تم لوگوں کو ان دونوں میاں بیوی میں (ایسی کشاکش کا) اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی عورت کے خاندان سے بھیجو اگر ان دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں اتفاق فرمادیں گے۔ (نساء)

اس آیت سے بھی وکالت کی مشروعیت ثابت ہے۔

## مؤکل کی شرائط:

مؤکل کے اندر ان شرط کا پایا جانا ضروری ہے کہ وہ عاقل بالغ ہو اور جس کام کے لئے دوسرے کو وکیل مقرر کر رہا ہے اس کام کو خود تمام کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اور شرعاً اس کے لئے ممنوع نہ ہو۔

## وکیل کی شرائط:

مؤکل کی طرح وکیل کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ عاقل و بالغ ہو اور جس کام کے لئے وکیل مقرر کیا جا رہا ہے اس کام کو تمام کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

## صحت وکالت کا ضابطہ:

فقہاء کرام نے صحت وکالت کے لئے ضابطہ مقرر فرمایا ہے۔

كل عقد جاز أن يعقده الإنسان لنفسه جاز له أن يوكل فيه غيره

وما لا يجوز فيه التوكيل فهو كل عمل لا تدخله النيابة

(فقه المعاملات)

یعنی ہر وہ عقد جو انسان خود منعقد کر سکتا ہے اس کے لئے کسی دوسرے کو وکیل مقرر کرنا بھی جائز ہے اور جس کام کے لئے شرعاً نیابت درست نہیں اس کے لئے وکیل مقرر کرنا بھی جائز نہیں۔

## عبادات بدنیہ کے لئے وکیل مقرر کرنے کا حکم:

عبادات بدنیہ جو انسان کے ذمہ فرض ہیں، جیسے نماز، روزہ، وضو، طہارت، وغیرہ اس قسم کی ان امور کے لئے کسی غیر کو وکیل مقرر کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ ایسی عبادات ہیں جن کی ادائیگی انسان کے ذمہ خود لازم ہے ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بندوں کا امتحان فرماتے ہیں تاکہ مطیع اور عاصی (گناہ گار) میں فرق معلوم ہو جائے۔

لقوله تعالى: ﴿ونبلوكم بالشر والخير فتنة وإلينا ترجعون﴾

(سورة الأنبياء: ۳۵)

## عبادات مالیہ کے لئے وکیل مقرر کرنے کا حکم:

عبادات مالیہ، جیسے زکوۃ، صدقہ، قربانی، کفارات مالیہ اور دیگر تمام نفلی کاموں کے لئے وکیل

مقرر کرنا جائز ہے، جیسے کسی کو زکوٰۃ ادا کرنے یا تقسیم کے لئے وکیل مقرر کرے۔

فقد وكل النبي ﷺ أبا هريرة بأن يحفظ أموال الصدقة ووكل بعض الصحابة بأن يجمعوا أموال الزكاة، ووكل عليا بأن ينحر عنه بقية الهدي من الإبل التي ساقها في حجة الوداع وكانت مائة ناقة نحر منها بنفسه ثلاثا وستين ووكل عليا بنحر الباقي فدل ذلك على جواز التوكيل بالأمور المالية. (فقه المعاملات)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو صدقات کے مال کی حفاظت کے لئے وکیل فرمایا اور بعض صحابہ کو اموال زکوٰۃ وصول کرنے کا وکیل بنایا، اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے سو اونٹ کی قربانی کی ۶۳ خود ذبح فرمایا اور باقی کے ذبح کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وکیل مقرر فرمایا۔

## عدالت میں وکالت کا پیشہ اختیار کرنے والوں کے لئے تنبیہ:

عدالت میں اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے یا مدعی کے غلط دعویٰ کی مدافعت کرنے کیلئے کسی کو وکیل مقرر کرنا یا کسی کا وکیل مقرر ہونا شرعاً جائز ہے، موکل مرد ہو یا عورت، نیز اس پر فریق مخالف راضی ہو یا ناراض، بہرحال شریعت کی طرف سے اجازت ہے کہ کوئی بطور وکالت اس کام کو انجام دے۔

البتہ کسی جھوٹے مدعی کی حمایت کرنا یا کسی ظالم کی طرف سے مدافعت کرنا، اس کی خاطر جھوٹ بولنا اور اس کو دوسروں سے بذریعہ عدالت مال لوٹ کر دینا یہ بہت بڑا گناہ ہے، ایسے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے، وکالت کا ایسا پیشہ جس میں ظالم کی حمایت مظلوم پر مزید ظلم ڈھایا جائے ملعون پیشہ ہے اس پر اجرت لینا بھی حرام ہے جیسا کہ ہم نے کتاب الاجارہ میں تفصیل سے بیان کیا، ایسے لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ ان کی چرب زبانی کب تک ان کے کام آئے گی۔

قوله تعالى: ﴿ هَاأَنتُمْ هَؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴾

(سورة النساء: ۱۰۹)

یعنی سنتے ہو تم لوگ جھگڑا کرتے ہو ان کی طرف سے دنیوی زندگی میں، پھر کون جھگڑا کرے گا ان کے بدلے اللہ سے قیامت کے روز یا کون ہوگا ان کا کارساز۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو ان کی طرف سے مدافعت کر رہے ہو ذرا سوچو قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہوگی، اس وقت کون کس طرف سے جواب دہی کرے گا، اس لئے جھوٹے دعویٰ کرنے والے اور جھوٹے مقدمے کی پیروی کرنے والے دونوں کو اپنا انجام سوچنا چاہئے۔

سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم، ارتفاع أصوات متخاصمين جاءا يتحاكمان عنده في أرض وقد ارتفعت أصواتهما أمام أحد حجرات بيوت أزواج النبي صلى الله عليه وسلم، فخرج النبي عليه الصلاة والسلام، وقد اجتمع بعض الناس حولهما، فقال صلى الله عليه وسلم: أيها الناس إنما أنا بشر، وإنكم تختصمون إلي أن تحاكموا عندي، ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض أي أقوى في الحجة من الآخر فأقضي له على نحو مما أسمع، فمن قضيت له من أخيه شيئا فلا يأخذه، فإنما هي قطعة من النار أقطعها له، فمن شاء فليأخذ ومن شاء فليدع.

(أخرجه البخاري في المظالم: ٢/٦٨، ومسلم: ١٧١٣)

وفي تتمة الخبر أن كلا من المتخاصمين بكى وقال كل واحد منهما: جعلت حقي من الأرض لأخي فأمرهما صلى الله عليه وسلم أن يقتسما الأرض بينهما ويضربا عليها قرعة ويتسامحا.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک دن جھگڑا وا ز یں بلند ہوتی ہوئی سنیں آپ ﷺ نے توجہ فرمائی تو فیصلے کے لئے آنے والے دو افراد تھے بعض ازواج مطہرات کے حجرے کے سامنے بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے، آپ علیہ السلام حجرہ مبارک سے نکل کر ان کے پاس تشریف لائے اور کچھ دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو: میں ایک انسان ہوں تم میرے پاس فیصلے کے لئے مقدمے لے کر آتے ہو، یہ بہت ممکن ہے تم میں بعض دوسرے

کے مقابلے میں چرب زبان ہوں اپنی بات کو زیادہ اچھے انداز میں پیش کریں اور مقدمہ جیت لیں حالانکہ وہ ناحق پر ہے اب میں نے دلائل کی بنیاد پر جس کے حق میں فیصلہ کر دیا اور اس کو باطل طور پر کسی کا حق مل گیا تو وہ سمجھ لے کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو میں نے اس کو دیا اب چاہے آگ پر صبر کرے جو چاہے چھوڑ دے۔ (بخاری)

آگے روایت میں ہے دونوں صحابہ یہ تقریر سن کر بہت روئے اور ہر ایک نے کہا کہ یہ زمین دوسرے کی ہے مجھے نہیں چاہئے اسی کو دیدی جائے تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا ایسا کرلو کہ آپس میں برابر تقسیم کرلو۔

وقوله تعالى: ﴿واتقوا يوما ترجعون فيه إلى الله ثم توفى كل نفس ما كسبت وهم لا يظلمون﴾ (سورة البقرة: ۲۸۱)

یعنی اس دن کے عذاب سے ڈرو جس دن تم اللہ کے پاس حاضر کئے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔

دنیا میں جیسے اعمال ہوں گے اسی کے مطابق جزا وسزا ہوگی اس لئے دنیا میں کسی پر ظلم کرتے وقت یا کسی ظلم کی حمایت کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کو ضرور یاد رکھنا چاہئے، جس دل میں خوف خدا ہوگا وہ کبھی گناہ سے لذت نہیں حاصل کر سکتا۔

(رزقنا اللہ التقویٰ)

## وکیل کے ضامن ہونے کا حکم:

جب بیع وشراء وغیرہ عقود ومعاملات کے لئے کسی کو وکیل مقرر کیا جائے اور شرائط وکالت پوری ہونے کے ساتھ عقد وکالت مکمل ہو جائے گا، اب وکیل کے ہاتھ میں موکل کا جو مال آئے گا وہ امانت کا مال ہوگا، لہذا اگر وہ مال وکیل کی تعدی یا کسی سستی وغفلت کے بغیر ہلاک ہو جائے تو وکیل کے ذمہ اس کا ضمان لازم نہ ہوگا، ہاں البتہ اگر وکیل کی تعدی سے یا حفاظت میں غفلت سے ہلاک ہو جائے تو ضمان لازم ہوگا، تعدی کی صورتوں میں سے یہ بھی ہے کہ سامان فروخت کرنے کے بعد قیمت وصول کرنے سے پہلے مال اس کے حوالہ کر دے بعد میں قیمت وصول نہ ہو سکے یا موکل کے لئے جو مال خریدا اس کو خود ہی استعمال کرنا شروع کر دے یا کسی غیر محفوظ جگہ پر چھوڑ دے وغیرہ۔ واللہ اعلم

### وکالت ختم ہونے کی صورتیں:

(۱) اگر وکیل یا مؤکل میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو وکالت کا معاملہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

(۲) یا مؤکل نے وکیل کو وکالت سے معزول کر دیا۔

(۳) یا وکیل نے خود اپنے کو معزول کر لیا یعنی مؤکل سے کہہ دیا کہ میں آئندہ آپ کی طرف سے وکالت نہیں کر سکتا۔

(٤) یا مؤکل نے جس کام کے لئے وکیل کیا تھا پھر وہ کام خود ہی انجام دے دے۔

(٥) یا جس مال کو فروخت کرنے کے لئے وکیل مقرر کیا تھا وہ مال ہی ہلاک ہو گیا یا مکان تھا منہدم ہو گیا وغیرہ۔

(٦) یا مؤکل خود مفلس ہو گیا ان تمام صورتوں میں وکالت ختم ہو جائے گی اس کے بعد وکیل کا تصرف نافذ نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

# کفالت کے احکام

### لغوی معنی:

الضم ۔ کقولہ تعالیٰ : ﴿ وکفلها زکریا ﴾

یعنی مریم کی حفاظت کو اپنے ذمہ لازم کر لیا

وقولہ علیہ السلام : "انا وکافل الیتیم کهاتین فی الجنة ۔"

(اخرجه البخاری ومسلم)

یعنی ارشاد فرمایا میں اور وہ شخص جو کسی یتیم کی پرورش کو اپنے ذمہ لازم کرے جنت میں قریب قریب ہوں گے۔

### شرعی معنی:

ضم ذمة الکفیل الی ذمة الاصیل فی المطالبة لا فی الدین.

یعنی اصطلاح شرع میں کفالت کا معنی یہ ہے کہ کفیل اپنے ذمہ کو اصیل کے ذمہ کے ساتھ دین کے مطالبہ میں ملاتا ہے نہ کہ دین کی ادائیگی میں۔

## کفالت کی خاص اصطلاحیں:

**کفیل:** دوسرے کی طرف ذمہ داری اٹھانے والا۔

**مکفول عنہ:** وہ شخص جس کی طرف سے کفیل ذمہ دار بنا۔

**مکفول لہ:** وہ حقدار جس کے حق کی وصولی کے لئے کفیل ضامن بنا۔

**مکفول بہ:** وہ مال جس کا کفیل ذمہ دار بنا۔

## کفالت کی مشروعیت:

کفالت یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے کہ بلا کسی معاوضے کے دوسرے کی طرف اس کے مال وحقوق کی ادائیگی کا ذمہ دار بننا۔

لیکن لوگوں کی حاجات وضرورتوں کے پیش نظر شریعت مطہرہ نے اس کی اجازت دی ہے۔

كما في قوله تعالى: ﴿ولمن جاء به حمل بعير وأنا به زعيم﴾

(يوسف: ٧٢)

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ جب پیالہ گم ہوگیا تو تلاش کرتے وقت انعام کا اعلان ہوا حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے کہ جو پیالہ لاکر دے گا اس کو انعام میں ایک اونٹ کا بوجھ غلہ دیا جائے گا، میں اس کا ضامن ہوں۔

وكما روي أن النبي صلى الله عليه وسلم أتي بجنازة رجل ليصلي عليه. فقال هل ترك دينا؟ قالوا لا، قال هل عليه دين؟ قالوا نعم ديناران. فقال صلوا على صاحبكم، قال أبو قتادة: هما علي يا رسول الله أي أنا ضامن لوفاء دينه فصلى عليه النبي صلى الله عليه وسلم. (أخرجه البخاري في كتاب الكفالة)

یعنی ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ میں حاضر ہوئے نماز پڑھانے سے پہلے آپ نے پوچھا کہ میت نے دین کی ادائیگی کے لئے کچھ مال چھوڑا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں، دو دینار ان کے ذمہ لازم ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پھر آپ لوگ خود اس میت پر نماز پڑھ لیں۔ (یعنی جنازہ کی نماز نہیں پڑھاؤں گا) چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے ان دیناروں کی ادائیگی کو اپنے ذمہ لازم لیا اس کے بعد آپ ﷺ نے جنازہ پڑھایا۔

فلما فتح الله عليه الفتوح ، اي فتحت عليه البلاد قال صلى الله عليه وسلم : انا اولى بالمؤمنين من انفسهم ، فمن ترك دينا فعلي قضاؤه ، ومن ترك مالا فلورثته

(اخرجه البخاري ايضا في الكفالة : ٢/٠٠٠ باب الدين)

یعنی جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں مؤمنین کا ان کی جان سے زیادہ قریب ہوں لہذا آئندہ کوئی شخص مقروض ہونے کی حالت میں انتقال کر جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔

## کفالہ کی اقسام:

کفالہ کی دو قسمیں:

(۱) کفالہ بالنفس

(۲) کفالہ بالمال

(۱) کفالہ بالنفس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اس بات کی ضمانت لے کہ میں مکفول کو مکفول لہ کے پاس یا حاکم کے پاس حاضر کردوں گا جس کو آج کے دور میں شخصی ضمانت کہا جاتا ہے۔ اب ضمانت کے بعد اگر وقت مقررہ پر حاضر نہ کرے تو اسی ضامن کو قید کیا جائے گا، تا کہ اس کو حاضر کردے، البتہ کفیل بالنفس سے وہ حق وصول نہیں کیا جائے گا جو مکفول کے ذمہ واجب ہوا ہے کہ کفیل مال کا بھی ضامن نہیں ہے۔

(۲) اور کفالہ بالمال میں اگر مکفول عنہ مال ادا نہ کرے تو کفیل کے ذمہ مال کی ادائیگی لازم ہوگی، بشرطیکہ دین صحیح ہو اور دین کی مقدار معلوم ہو یا کفالہ بالعین یعنی کسی متعین چیز کی کفالت اٹھائی مثلاً مبیع کے بارے میں کہا کہ اگر بائع نے ادا نہ کیا تو میرے ذمہ ہے یا مال مغصوب غاصب نے فلاں وقت تک واپس نہ کیا تو میں ذمہ دار ہوں۔

## کفالہ کے مسائل:

(1) کفالہ مکفول لہ کی اجازت اور رضا کے بغیر درست نہیں کیونکہ یہ اس کا حق ہے، اسی طرح دوسرے عقود کی طرح کفالہ میں بھی ایجاب وقبول ضروری ہے۔

(2) کفالہ کو کسی مناسب شرط کے ساتھ معلق کرنا جائز ہے، مثلاً اگر آپ نے فلاں

ضامن بننے کے لئے کافی ہے، تو مالدار نے کہا تو نے سچ کہا ہے، اس نے مجھے ایک ہزار دینار دیئے ایک متعین مدت کے لئے، جب وہ مدت پوری ہوگئی مقروض شخص ایک ہزار دینار لے کر روانہ ہوا۔ (اس کے اور مالدار کے گاؤں کے درمیان دریا حائل تھا) اور کشتی کے انتظار میں دریا کے کنارے کھڑا رہا لیکن کوئی کشتی نہ مل سکی، دن پورا ہو رہا تھا، اس لئے اس نے یہ ترکیب کی کہ ایک لکڑی لی اس میں سوراخ کر کے ہزار دینار بھر دیئے پھر اس کو اچھی طرح بند کر دیا ایک پرچی بھی اس میں رکھ دی اس کے بعد دریا کے کنارے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ میں نے آپ کو اپنے معاملہ کا گواہ اور ضامن بنایا تھا اب میں نے قرض ادا کرنے کے لئے مقدور بھر کوشش کی لیکن میری قدرت میں نہیں ہے اب یہ دینار تیرے پاس امانت ہیں، یوں کہہ کر سمندر میں پھینکا وہ سمندر کے تہہ میں چلا گیا، پھر سواری تلاش کرتا رہا، دوسری طرف مالدار شخص بھی دریا کے کنارہ میں کھڑے انتظار کر رہا تھا کہ مقروض شخص آج میرا مال لے کر آئے گا لیکن کوئی کشتی نظر نہیں آئی اتنے میں دیکھا کہ ایک لکڑی بہہ رہی ہے جلانے کی نیت سے اس کو اٹھایا اور گھر لے جا کر اس کو چیرا تو اس میں سے دینار اور پرچی ملی، اگلے دن وہ مقروض شخص بھی پہنچ گیا اور اس سے معذرت کی کہ وقت مقررہ پر میں آپ کا قرض سواری نہ ملنے کی مجبوری سے ادا نہ کر سکا اور واقعہ سنایا تو مالدار شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امانت میرے پاس پہنچا دی ہے، پھر ہزار دینار اس کو دوبارہ ہبہ کر دیا اور کہا کہ اللہ آپ کا بھلا کرے یہ ہزار دینار لے کر گھر جائیں۔

(بخاری شریف باب الکفالۃ فی القرض ۲/۹۳)

یہ ہے اخلاص وفاداری، امانت داری، اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد کی برکت۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس کی توفیق دے۔ آمین

# احکام حوالہ

**حوالہ کے احکام:**

**حوالہ لغت میں نقل وتحویل کو کہا جاتا ہے۔**

"یقال تحول حالہ من الفقر الی الغناء۔"

یعنی اس کی حالت فقر سے مالداری کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔

## اصطلاحی معنی:

" نقل الدین من ذمة الی ذمة شخص آخر ."

یعنی اصطلاح فقہاء میں حوالہ کہا جاتا ہے قرض کو ایک شخص کی ذمہ سے دوسرے کی ذمہ داری کی طرف پھیر دینا۔

## حوالہ کی اصطلاحات:

محیل: مدیون جو اپنے ذمہ واجب الادا قرض کو دوسرے کے حوالہ کر رہا ہے۔

محال علیہ: جو دوسرے شخص کے قرض کی ادائیگی کو اپنے ذمہ میں قبول کر رہا ہے۔ دائن (محتال لہ) وہ قرض خواہ جس کا قرض محیل کے ذمہ لازم ہے۔

## حوالہ کی مشروعیت:

حوالہ کی مشروعیت حدیث واجماع سے ثابت ہے۔

عن ابی هريرة رضى الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال " مطل الغنى ظلم واذا اتبع احدكم على مليٌ فليتبع ."

(اخرجه البخارى فى كتاب الحوالة : ٢/٣٧ ، ومسلم : رقم ١٥٦٤)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مالدار کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے۔

جب تم میں سے کسی کو (قرض کے مطالبہ میں) مالدار کے حوالے کیا جائے تو اس کا پیچھا کرے یعنی محال علیہ (مالدار) سے مطالبہ کرے۔ (بخاری، مسلم)

وقال فى اللباب : الحوالة جائزة بالديون دون الاعيان وتصح برضاء المحيل وهو المديون ، والمحتال وهو الدائن لان فيه انتقال حقه الى ذمة اخرى ، والذمم متفاوتة والمحال عليه وهو يقبل الحوالة لان فيها الزام الدين ولا الزام بلا التزام .

(اللباب فى شرح كتاب القدورى ، ٢/١٦٠)

## حوالہ کے احکام:

(١) دائن، مدیون محال علیہ کی رضا مندی سے عقد حوالہ مکمل ہونے کے بعد مدیون

کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

(۲) اس کے بعد دائن کو حق ہوگا کہ اپنے قرض کا محتال علیہ سے مطالبہ کرے۔

(۳) اگر قرض کی ادائیگی سے پہلے محتال علیہ انتقال کر جائے یا غریب ہو جائے یا قرض ادا کرنے سے انکار کر دے تو دائن کو حق ہوگا کہ دوبارہ مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کرے، کیونکہ مدیون سے مطالبہ کا حق اس وقت ساقط ہوتا ہے جب کہ قرض محتال علیہ سے وصول ہو، وصول نہ ہونے کی صورت میں اس کا حق باقی رہے گا۔ (ملتقی الابحر: ۲/۲۲۲)

(۴) اگر محتال علیہ قرض ادا کر دے تو اب اس کو مدیون سے وصول کرنے کا حق حاصل ہوگا دو شرطوں کے ساتھ: ایک یہ کہ مدیون کے حکم سے ذمہ داری قبول کی ہو۔ (دوسرے) اس کے ذمہ مدیون کا کوئی قرض نہ ہو، اگر قرض ہو تو مطالبہ کا حق نہ ہوگا، کیونکہ اس نے اپنا حق تو پہلے وصول کر لیا۔

## "احکام الجعالۃ" یعنی انعامات کے احکام:

کسی کام کے انجام دینے والے کے لئے انعام مقرر کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے، مثلاً جو امتحان میں اول آئے گا اس کے لئے اتنا انعام ہوگا یا کسی کی کوئی چیز گم ہو گئی اس نے اعلان کیا جو تلاش کر کے لا کر دے گا اس کو اتنا انعام دیا جائے گا یا گھوڑ دوڑ یا کشتی وغیرہ میں انعام کا اعلان کیا جائے اس طرح کا انعام مقرر کرنا بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

ہم گھوڑ دوڑ کے سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا ایک فتویٰ نقل کرتے ہیں جس کے ضمن میں انعام مقرر کرنے کے جواز کی تفصیل، شرائط وغیرہ تمام باتیں واضح ہو جائیں گی۔

## گھوڑ دوڑ کے شرعی احکام:

آج کل مسلمانوں کی معاشرت، معاملات، اخلاق اسلام سے جس قدر بیگانہ ہو گئے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں، سود، قمار، رشوت، جو قرآن و حدیث کی بے شمار تصریحات سے باجماع امت حرام ہیں، آج مسلمانوں کا کوئی بازار، کوئی سوسائٹی، کوئی گھرانہ ان سے خالی نہیں الا ماشاء اللہ۔

ان بلاؤں کا شکار ایک تو وہ طبقہ ہے جس کو حلال و حرام اور شریعت کی موافقت و مخالفت کی طرف کوئی التفات ہی نہیں ان کے سامنے تو ان کے احکام پیش کرنا ایک درجہ میں بے سود ہے، لیکن ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو بحمد اللہ اس کی فکر رکھتا ہے مگر ناواقفیت یا غفلت کی وجہ سے ان میں مبتلا ہے، ایسے لوگوں کے لئے ضرورت ہے کہ ان کو صحیح احکام سے آگاہ کیا جائے، اکثر مسائل میں

سے آج کل ایک مستقل فن (گھوڑ دوڑ) کا ہے جس میں جوا عام ہے شریعت اسلام نے جو ذاتی اور مستقل انتظام میں ہر کھیل سے مطلقاً روکا گیا ہے اور جس کو غیر محدود وسعت دی گئی ہے، بلکہ جن کھیلوں کے ذریعہ قوت جہاد اور قوت جسمانی پیدا ہوتی ہے ان کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن قرار دیا ہے خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے اس کے استحسان کو ثابت فرمایا آپ ﷺ نے خود گھوڑ دوڑ کرائی، پیدل دوڑ پر انعام دیا، تیر اندازی اور پیراکی سیکھنے کی ہدایت فرمائی، جسم کی تیز بازی کی مشق کا خود مظاہرہ ہو کر معائنہ فرمایا اور حضرت صدیقہؓ کو دکھایا وغیرہ اور اس کے مقابل ایسے کھیل جن میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہیں یا جن میں انفرادی یا اجتماعی مضرتیں ہیں ان کو سختی سے منع فرمایا انہیں مضر صورتوں میں وہ کھیل ہیں جن میں قمار (جوا) ہو۔

گھوڑ دوڑ جیسا کہ اوپر معلوم ہوا ایک مفید کھیل ہے اور رسول اللہ ﷺ نے قولاً و عملاً اس کی اجازت دی ہے اور اس میں بازی لگانے اور بازی لے جانے والے کے لئے مشروط انعام وصول کرنے کی بھی خاص شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے لیکن افسوس ہے کہ آج کل کفر کے جو ابرات چھوڑ کر دوسروں کے دوڑ دوڑ پر بازی لگانے کو ہی مقصد سمجھنے لگے، یہاں تک کہ عام کھیلوں میں بھی غیروں کی نقالی ہی رہ گئی اس نقالی میں کوئی دوسری مضرت نہ ہوتی جب بھی ایک غیرت مند قوم کے لئے نازیبا تھی خصوصاً جب کہ غیر مسلموں نے قمار جیسی حرام چیز اس کو ان میں شامل کر دیا تو مسلمان پر لازم ہو گیا کہ ان سے مکمل اجتناب کرے۔

ہماری گھوڑ دوڑ بھی اسی قسم کی نقالی کی جو چیز اسباب جہاد میں داخل اور ذریعہ عبادت تھی وہ اب محض ایک قمار اور لہو و لعب بن کر رہ گئی اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ہمارے محترم حضرت قبلہ الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل پاکستان کو کہ انہوں نے گھوڑ دوڑ کے متعلق علماء سے استفسار کرنے کی ضرورت محسوس فرما کر بعض علماء سے فتویٰ حاصل فرمایا پھر علماء پاکستان سے استفسار کیا کہ اس سوال کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک مفید مجموعہ ہو گیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ عام فائدہ کیلئے اس کو بصورت رسالہ شائع کر دیا جائے جس میں گھوڑ دوڑ کی جائز و ناجائز قسمیں اور ہر قسم کیلئے ضروری شرائط کی تفصیل درج ہے۔ واللہ الموفق والمعین

بہت سے کام ایسے ہیں کہ ان کی صورت کھیل تماشہ ہے مگر ان کے ذریعہ قوت جہاد، صحت جسمانی وغیرہ کے اہم فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں ایسے کھیلوں کو شریعت اسلام نے نہ صرف جائز

گھوڑے دوڑانے پر بازی لگا رہے ہیں آپس میں کسی کی کسی سے وہ لینا دینا نہ ہو، بلکہ حکومت وقت یا کسی تیسرے شخص یا جماعت کی طرف سے بطور انعام کوئی رقم آگے بڑھنے والے کے لئے مقرر ہو، بدائع الصنائع میں ہے

> وكذلك ما يفعله السلاطين وهو أن يقول السلطان لرجلين من سبق منكما فله كذا فهو جائز لما بينا أن ذلك من باب التحريض على استعداد أسباب الجهاد خصوصا من السلطان.

(بدائع: ۶/۲۰۶، شامی: ۵/۲۵۳)

(2) دوسری صورت یہ ہے کہ آگے بڑھنے والے کیلئے معاوضہ یا انعام فریقین ہی میں سے ہو مگر صرف ایک طرف سے ہو دو طرفہ شرط نہ ہو مثلاً زید و عمر گھوڑوں کی دوڑ میں بازی لگا رہے ہیں، زید یہ کہے کہ اگر عمر آگے بڑھ گیا تو میں اس کو ایک ہزار انعام دوں گا، دوسری طرف سے یہ نہ ہو کہ اگر زید بڑھ گیا تو عمر ایک ہزار دے گا، دو طرفہ شرط کی صورت قمار حرام ہے۔

(3) فریقین میں دو طرفہ شرط بھی حنفیہ کے نزدیک ایک خاص صورت میں جائز ہے وہ یہ کہ فریقین ایک تیسرے گھوڑے سوار مثلاً خالد کو اپنے ساتھ شریک کر لیں پھر اس کی دو صورتیں ہیں

(الف) شرط کی صورت یہ ٹھہرے کہ زید آگے بڑھے تو عمر ایک ہزار روپیہ اس کو دے اور عمر آگے بڑھے تو زید اتنی ہی رقم اس کو ادا کرے اور اگر خالد بڑھ جائے تو اس کو کچھ دینا کسی کے ذمہ نہیں۔

(ب) شرط اس طرح ہو کہ خالد آگے بڑھ جائے تو زید و عمر دونوں اس کو ایک ایک ہزار روپیہ دیں اور زید و عمر دونوں یا ان میں سے کوئی ایک آگے بڑھے تو خالد کے ذمہ کچھ نہیں، لیکن زید و عمر میں باہم جو آگے بڑھے دوسرے پر اس کو ایک ہزار ادا کرنا لازم آئے گا۔

ان دونوں صورتوں میں جو تیسرا آدمی شریک کیا گیا ہے اس کو حدیث کی اصطلاح میں محلل کہا گیا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ امر مشترک ہے کہ تیسرے آدمی کا معاملہ نفع و ضرر میں دائر نہیں بلکہ ایک صورت میں اس کا نفع متعین ہے، دوسری میں اس کا کچھ نقصان نہیں۔

شرط اس تیسری صورت کے لئے حسب تصریح حدیث یہ ضروری شرط ہے کہ یہ تیسرا گھوڑا

### تنبیہ:

جوا کا حکم اور جائز و ناجائز کی تفصیل گھوڑدوڑ میں لکھی گئی ہے یہی حکم اونٹوں کی دوڑ اور پیادہ دوڑ اور نشانہ بازی لگانے کا ہے۔ (کما مر فی الحدیث)

## دوسرے کھیلوں میں بازی لگانے کے احکام:

مذکورہ الصدر اقسام چہارگانہ یعنی گھوڑ دوڑ، اونٹوں کی دوڑ، پیادہ دوڑ، نشانہ بازی کے علاوہ دوسرے کھیلوں میں یہ تفصیل ہے۔

## مفید کھیل:

جن کھیلوں سے کچھ دینی یا دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ جائز ہیں بشرطیکہ انہیں فوائد کی نیت سے ان کو کھیلا جائے، محض لہو ولعب کی نیت نہ ہو، لیکن اس کی بازی پر کوئی معاوضہ یا انعام مشروط مقرر کرنا جائز نہیں۔

مثلاً گیند کا کھیل اس سے جسمانی ورزش ہوتی ہے یا لاٹھی وغیرہ کے کھیل یا پہلوانوں کی کشتی وغیرہ جو قوت جہاد میں معین ہو سکتے ہیں، اسی طرح معمہ بازی، شعر بازی، تعلیمی تاش، وغیرہ بانیت کی بازی لگانا جائز ہے مگر اس پر کوئی رقم معاوضہ کی مقرر کرنا جائز نہیں، بلکہ حرام ہے۔

ولا یجوز الاستباق فی غیر ہذہ الاربعۃ کالبغل بالجعل واما بلا جعل فیجوز فی کل شیء وقال بعد ذلک لان جواز الجعل فیما مر انما ثبت بالحدیث علی خلاف القیاس فیجوز ما عداھا بدون الجعل وفی القہستانی عن الملتقط من لعب بالصولجان یرید الفروسیۃ یجوز وعن الجواہر قد جاء الاثر فی رخصۃ المصارعۃ لتحصیل القدرۃ علی المقاتلۃ دون التلہی فانہ مکروہ۔

(شامی: ۵/۲۵۵)

## بے فائدہ کھیل تماشے:

ایسے کھیل تماشے جن کے تحت کوئی معتد بہا فائدہ دین و دنیا کا نہیں ہے وہ سب ممنوع اور ناجائز ہیں خواہ ان پر بازی لگائی جائے یا انفرادی طور پر کھیلا جائے پھر بازی پر کوئی رقم لگائی جائے یا نہیں، اور رقم بھی دو طرفہ ہو یا ایک طرفہ بہرحال ایسے لغو کھیل شرعاً مطلقاً ناجائز ہیں۔

حدیث میں ہے

"كل لهو المسلم حرام الا ثلاثة ملاعبة اهله و تاديبه لفرسه

ومناضلة بقوسه." (شامی: ۶/۴۰۳)

کبوتر بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، چوسر، شطرنج، تاش، کتوں کی ریس وغیرہ

سب اسی ناجائز صورت کے قرار ہیں۔ (ماخوذ از جواہر الفقہ: ۲/۳۵۲)

ان کھیلوں کے احکام کی مزید تفصیلات جلد اول میں گذر چکی ہے۔

# احكام الهبة

"ہبہ لغت میں بلا عوض تحفہ دینے کو کہا جاتا ہے۔"

كما في قوله تعالى: ﴿يهب لمن يشاء اناثا ويهب لمن يشاء

الذكور﴾ (شورى: ۴۹)

شرعا: تمليك عين بلا عوض بمعنى وجه الاخوة والمحبة، كما

قال صلى الله عليه وسلم: تهادوا تحابوا. (بخاری ادب المفرد)

شرعاً ہبہ کہا جاتا ہے کسی چیز کو بلا عوض محض اخوت ومحبت کی بنیاد پر دوسرے کو مالک بنانا

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو اس سے آپس میں محبت پیدا ہوگی۔

آپ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور بدلہ بھی عطا فرماتے تھے۔

وقال صلى الله عليه وسلم: "لو اهدي الي كراع لقبلت

ولو دعيت عليه لاجبت."

(اخرجه احمد و ترمذی و بخاری: ۲/۸۷)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مجھے بکری کی ایک ٹانگ بھی ہدیہ کیا جائے

تو میں اس کو قبول کروں گا، اگر اس کی دعوت کی جائے تو اس کے لئے حاضر ہوں گا۔

## ہبہ کی مشروعیت کی حکمت:

شریعت مطہرہ نے ہدیہ کو مشروع فرمایا اس کی ترغیب دی کیونکہ اس میں ایک مسلمان

بھائی کی دلجوئی ہے اور محبت کے تعلق کو جوڑتا ہے ہدیہ دلوں سے عداوت و نفرت کا خاتمہ کرتا ہے۔

محبت وتعلق کا بیج بوتا ہے، ایک دوسرے کے لئے ہمدردی و خیر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

احسن الی الناس تستعبد قلوبهم

فطالما استعبد الانسان احسان

یعنی لوگوں پر احسان کرو، ان کے دلوں کو خرید لے

کیوں کہ عام طور پر احسان انسان کو غلام بنا لیتا ہے

یعنی اس کی تابعداری کو خرید لیتا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ ہدیہ کو پسند بھی فرماتے تھے، اگرچہ ہدیہ دینے والے کا مال تھوڑا ہو اور ہدیہ لانے والے کو بدلہ میں ہدیہ سے افضل و بہتر چیز عنایت فرماتے، آپ نے اسلام خواتین کو تعلیم فرمایا:

"یا نساء المسلمات، لا تحقرن جارة لجارتها ولو فرسن شاة."

(بخاری، کتاب الھبۃ: ۸۷/۲)

"اے مسلمان خواتین کوئی خاتون اپنی پڑوسن کو معمولی چیز ہدیہ کرنے کو حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کا ایک کھر ہی ہو۔" اسی طرح بخاری شریف میں روایت ہے کہ صحابہ کرام کو آپ ﷺ کا حضرت عائشہؓ سے محبت فرمانا معلوم تھا اس لئے جو لوگ آپ ﷺ کو ہدیہ کرنا چاہتا تو انتظار کرتے یہاں تک کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری ہوتی تو حضرت عائشہؓ کے گھر آپ ﷺ کے لئے ہدیہ بھیجتے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے لوگوں کے اس عمل کے متعلق آپ ﷺ سے گفتگو کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے عائشہ کے بارے میں اذیت نہ پہنچاؤ، کیوں کہ حضرت عائشہ کے علاوہ کسی اور بیوی کے بستر پر مجھ پر وحی نہیں اتری، تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اس خیال سے توبہ کرتی ہوں۔ (ماخوذ بخاری: ۸۷/۲)

حاصل یہ ہے کہ ہدیہ کا عمل صحابہ میں جاری تھا اور آپ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور استعمال فرماتے، صدقہ اگر کوئی لاتا تو وہ استعمال نہیں فرماتے بلکہ غریب صحابہ کو عطا دیتے تھے۔

### ہبہ کے ارکان اور شرائط:

کسی کو کوئی چیز ہبہ کرنا شرعاً ایک تبرع محض ہے، اس لئے بیع وشراء کی طرح مستقل ایجاب وقبول کی تو ضرورت نہیں، لیکن ہبہ کیلئے ایسے الفاظ کا ہونا ضروری ہے، جو مالک

بنانے پر دلالت کرے، عربی میں الفاظ "وھبت" ہبہ کر دیا، "ملکت" "عطیت" دیا، "اعطیت" آپ کو مالک بنا کر دے دیں، جب کسی ایسے لفظ جو مالک بنانے پر دلالت کرے کسی کو مالک بنا دے تو یہ مکمل ہو جائے گا، البتہ ہبہ تام ہونے کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ وہ مال ہبہ کرنے والے کا مملوک ہو اور تقسیم شدہ ہو، جو کہ ناطور پر ہبہ کر کے، مالک بنا دے تو موہوب لہ کے قبضہ کرنے سے ہبہ تام ہو جائے گا۔ گویا کہ واہب کی طرف سے تملیک موہوب لہ کی طرف سے قبضہ ضروری ہوا، اس کے بغیر ہبہ تام نہ ہوگا، اس کو ایجاب وقبول سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح واہب عاقل بالغ ہونا، شئی موہوب کا مالک ہونا اور شرعاً تصرفات کے بارے میں اس پر کسی قسم کی پابندی نہ ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح موہوب کا قیمتی (مال) ہونا ضروری ہے، لہذا شراب، مردار، خنزیر وغیرہ ہبہ کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح شئی موہوب پر قبضہ کرنا ممکن ہونا ضروری ہے، لہذا جو دودھ ابھی تک تھن میں ہے یا جو اون جانور کی پشت پر ہے اس کا ہبہ کرنا جائز نہیں، ہاں البتہ ہبہ کے بعد دودھ نکال کر یا اون کاٹ کر کے دے دے تو صحیح ہو جائے گا۔

## مرض الموت میں ہبہ کرنے کا حکم:

**مرض الموت کی تعریف:** کسی انسان کو ایسی بیماری لاحق ہو جائے کہ اس سے موت واقع ہونا یقینی ہو اور اس سے موت واقع ہو جائے تو اس کو مرض الموت کہا جاتا ہے۔

مرض الموت میں مریض اگر کوئی چیز ہبہ کرے تو یہ ہبہ وصیت کے حکم میں ہوگا، اب اگر موہوب لہ ایسا قریبی رشتہ دار ہے کہ موت کے بعد وارث بنے گا، چونکہ اس کے حق میں وصیت کرنا شرعاً باطل ہے اس لئے یہ ہبہ باطل ہوگا، اور مال بدستور واہب کی ملک میں برقرار رہے گا۔

لقوله عليه الصلاة والسلام: "إن الله قد أعطى كل ذي حق حقه، ألا لا وصية لوارث"

(ترمذی رقم ۲۱۲۰، باب ما جاء لا وصية لوارث)

اگر موہوب لہ اجنبی شخص یا رشتہ دار غیر وارث ہو تو یہ ہبہ ترکہ کے تہائی حصہ تک نافذ ہوگا، اس سے زائد میں الا یہ کہ تمام ورثہ بالغ ہوں اور وہ زائد کی اجازت دے دیں۔

لقوله عليه السلام: "إن الله تصدق عليكم في آخر أعماركم بثلث أموالكم، تضعونها حيث شئتم"

(ابن ماجه في الوصايا واحمد في المسند ٦: ٤٤١)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر انعام فرمایا کہ تہائی مال کی حد تک تمہیں تصرف کرنے کی اجازت دی، جہاں چاہو کارِ خیر میں خرچ کرو۔

اگر مرض الموت میں ہبہ کرنے کے بعد مریض پھر تندرست ہو گیا تو اگر موہوب لہ نے مالِ ہبہ پر قبضہ کر لیا تھا تو ہبہ تام ہو گیا، اس ہبہ کا حکم مرض الموت کے ہبہ کا نہ ہوگا۔

## ہبہ مشاع کا حکم:

جو چیز قابل تقسیم ہو (یعنی تقسیم کے بعد بھی اس سے اسی طرح فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے جس طرح سے تقسیم سے پہلے) اس کو اگر غیر منقسم ہبہ کر دیا جائے تو یہ ہبہ فاسد ہے، کیونکہ اصل مذہب یہی ہے کہ ہبۃ المشاع مفسد ہے، البتہ ایک روایت یہ ہے کہ فسادِ ہبہ اس وقت ہے جب کہ اجنبی کو ہبہ کیا جائے، اور جو شریک جائیداد کا ہو اس کو غیر منقسم ہبہ کرنا بھی صحیح ہے، اور بعض فقہاء نے اس کو مختار بھی کہا ہے۔

قال في الدر: وفي التصحيح فيه عن العتابي: وقيل يجوز لشريكه، وهو المختار اهـ. (٤/٧٨)

مگر یہ قول ظاہر مذہب کے خلاف ہے اس لئے بدون مجبوری اس پر عمل کرنا درست نہیں، اور غالباً آج کل تقسیم جائیداد میں جس قدر حرج اور پریشانی ہوتی ہے وہ مجبوری اور دشواری کی حد میں داخل ہے، اس لئے اس صورت میں اگر اس روایت پر عمل کر کے شریک کے لئے ہبہ بدون تقسیم کے صحیح کہا جائے تو گنجائش ہے اور قبضہ کے بعد اس کو مفید ملک کہا جائے گا، لیکن بہتر صورت یہی ہے کہ احتیاط کے لئے یا تو جائیداد تقسیم کر دی جائے یا اس کا بیع نامہ کر لیا جائے اور ثمن زبانی بھی کافی ہے تحریر کی ضرورت نہیں۔ (امداد الاحکام ٤: ٢٨١)

مطلب یہ ہے کہ شریک کو غیر منقسم چیز ہبہ کرنے کے لئے ایک حیلہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اس کو اپنا حصہ فروخت کر دے پھر قیمت اسے ہبہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انتہائی کم قیمت پر فروخت کر دے جس کی ادائیگی موہوب لہ پر دشوار نہ ہو۔

## اپنی زندگی میں ورثہ میں مال تقسیم کرنے کا حکم:

اس سلسلہ میں ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے جس کے ضمن میں یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

سوال: میں ایک ریٹائرڈ عمر رسیدہ شخص ہوں میری کوئی اولاد نہیں صرف بوڑھی بیوی ہے، جبکہ میرے دو بھتیجے ہیں، میں اپنی زندگی میں اپنا سرمایہ ان میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، تو شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

جواب: اگر آپ اپنا سرمایہ اپنی زندگی میں ہی ان میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو شرعاً آپ کو اختیار ہے کہ جس وارث کو جتنا چاہیں دے دیں، لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے کل مال کا ۱/۴ حصہ اپنی بیوی کے نام کر دیں، باقی مال کے دو برابر حصے کر کے ہر ایک بھتیجے کو ایک ایک حصہ دیدیں، اگر اس مال سے اپنے لئے بھی کچھ رکھنا چاہتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ دونوں بھتیجوں کا حصہ ان کے قبضہ میں دینا ضروری ہے ورنہ ہبہ تام نہ ہوگا۔

ثم قال العلامة ابراهيم الحلبي: هي تمليك عين بلا عوض وتصح بايجاب وقبول وتتم بالقبض فان قبض في المجلس بلا اذن صح وبعده لا بد من الاذن.

(ملتقى الابحر على صدر مجمع الانهر، ۲/۴۸۹ كتاب الهبة)

## حصول منافع کا ہبہ:

سوال: ایک شخص نے ٹیکسی خرید کر اس شرط پر بیٹے کو دی کہ اس سے تم گھر بیوی بچوں کا خرچہ برداشت کرو، گاڑی کی ملکیت میری ہوگی، اس معاہدہ پر گواہ بھی موجود ہے، اب اس شخص کا انتقال ہو گیا ہے، بیٹے نے گاڑی پر قبضہ کر لیا اور ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کو ترکہ میں شامل کرنے کے لئے تیار نہیں، اب شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ باپ نے اس بیٹے کو صرف منافع کا مالک بنایا ہے، تو منافع کے ہبہ سے اصل چیز کا ہبہ لازم نہیں آتا اس لئے گاڑی باپ کی ملکیت میں ہونے کی وجہ سے ترکہ میں شامل ہوگی، اور دیگر ورثہ کا بھی اس میں حق ہوگا، اس بیٹے کا اکیلے اس پر قبضہ کرنا

ملکیت کا دعویٰ کرنا شرعاً درست نہ ہوگا۔

## بیوی کا حق مہر ہبہ کرنے کا حکم:

نکاح ہونے کے بعد حق مہر کا مالک بیوی خود ہے، وہ اگر کل حق مہر یا اس کا بعض حصہ ادا کی ہوا اگر ادا کے شوہر کو ہبہ کر دے تو شوہر اس کا مالک ہو جائے گا، بعد میں اگر دونوں میں کسی وجہ سے نا اتفاقی ہو جائے اس کی وجہ سے بیوی اپنے ہبہ سے رجوع کرنا چاہے اور مہر کا دوبارہ مطالبہ کرے تو شرعاً یہ درست نہیں۔

وکذا ما وهب احد الزوجين الآخر لأن المقصود فيها الصلة كما في القرابة۔ (هدايه: ۲۷۴/۳)

لیکن بعض علاقوں میں دستور ہے کہ شادی کے بعد زبردستی بیوی سے حق مہر معاف کرواتے ہیں اور اس کو بیوی کی طرف سے ہبہ سمجھتے ہیں، شرعاً یہ ہبہ معتبر نہیں، شوہر کے ذمہ بیوی کا حق مہر بدستور لازم ہے۔

قال العلامة محمد خالد الاتاسي: يلزم في الهبة رضاء الواهب فلا تصح الهبة التي وقعت بالجبر والاكراه۔

(مجلة الاحكام ماده: ۸۶۰، ص ۴۷۶، الباب الثاني شرائط الهبه)

## ایک سنگین غلطی:

بعض لوگ اپنی زندگی میں مکان یا دیگر کوئی جائیداد ورثاء کو ہبہ کرنا چاہتے ہیں، اس بارے میں عموماً دو طرح کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

(۱) مشترک چیز ہبہ کر دیتے ہیں مثلاً مکان کسی نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو دے دیا، جبکہ شرعاً مشترک چیز کا ہبہ جائز نہیں، جب تک تقسیم کر کے دونوں کو اپنے اپنے حصے کا مالک نہ بنا دے، ہبہ تام نہ ہوگا، اسی حالت میں باپ کا انتقال ہو جائے تو یہ مکان ترکہ میں داخل ہو کر تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

(۲) ہبہ میں موہوب لہ کا قبضہ ضروری ہے کہ بعض لوگ ہبہ دیتے ہیں جیسا کہ باپ نے کہہ دیا کہ میں نے یہ مکان/دکان فلاں بیٹے کو دے دیا، اس کے بعد تا حیات اسی مکان میں رہائش پذیر رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے بیٹے کو دے دیا اور بیٹا مالک بن گیا، حالانکہ مکان باپ کے

سامان کے ساتھ مشغول ہونے کی وجہ سے بیٹے کا قبضہ تام نہیں ہوا ہے جس کی وجہ سے ہبہ تام نہیں ہوا۔ صحیح طریقہ اس کا یہ ہے کہ آپ اپنا سامان نکال کر مکان خالی کر کے بیٹے کے حوالے کر دیں یا یہ کہ بیٹے سامان کے مکان ہبہ کر دیں۔

## مشترک طور پر ہبہ کرنے کا حکم:

سوال: چند شرکاء نے اپنی کوئی مشترک چیز کسی ایک شخص کو ہبہ کر دی ایک عالم فرماتے ہیں کہ یہ ہبہ صحیح نہیں، رہنمائی فرمائیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ہبۃ المشاع کی یہ صورت صحیح ہے بشرطیکہ ہبہ سے مانع وہ شیوع ہے جو موہوب لہ کے پاس ہو۔

ولا تصح الهبة للشريك لانه لم يوجد الافراز المشروط لتمام القبض . (أحسن الفتاوى : ٧/٢٥٥)

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله : وفي الاصل ومن شرائطها اى الهبة الافراز حتى لايجوز هبة المشاع فيما يحتمل القسمة كالبيت والدار والارض ونحوها وان كان لا يحتمل القسمة يجوز كالبئر والحمام والرحى. (خلاصة الفتاوى : ٤/٣٩٠ كتاب الهبة ، الفصل الثالث فيما يكون عطاء وفيما لا يكون .

## ناقابل تقسیم اشیاء کا ہبہ:

جو چیزیں ناقابل تقسیم ہوں ان کے ہبہ کا کیا طریقہ ہے مثلاً ایک شخص نے اپنے جانور کو اس طرح ہبہ کیا کہ ایک حصہ اپنے لئے رکھا، دو حصے بیوی کو ہبہ کئے اور تین حصے بھائی کو اب اس شخص کا یہ ہبہ صحیح ہوا یا نہیں؟

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ جو اشیاء قابل تقسیم ہوں ان کا ہبہ تو قبل التقسیم صحیح نہیں جیسا کہ اوپر کے مسائل میں تفصیل سے معلوم ہوا البتہ جن اشیاء کی تقسیم ممکن نہ ہو مثلاً جانور ان کا ہبہ تقسیم سے پہلے صحیح ہے لہٰذا اس شخص کا ہبہ کرنا صحیح ہوا۔

قال العلامة الخوارزمي رحمه الله : هبة المشاع فيما لا يقسم جائزة يعني به مالا يحتمل القسمة اى لا يبقى منتفعا بعد القسمة

وآثم.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى : ( قوله وعليه الفتوى ) اى على قول ابي يوسف رحمه الله تعالى من ان التنصيف بين الذكر والانثى افضل من التثليث الذى هو قول محمد رحمه الله تعالى رملي ( رد المحتار : ٤/ ٥٧٣ )

وقال الامام طاهر بن عبد الرشيد رحمه الله تعالى : وفي الفتاوى رجل له ابن وبنت اراد ان يهب لهما شيئا فالافضل ان يجعل للذكر مثل حظ الانثيين عند محمد رحمه الله تعالى وعند ابي يوسف رحمه الله تعالى بينهما سواء هو المختار لورود الآثار.

ولو وهب جميع ماله لابنه جاز في القضاء وهو آثم نص عن محمد رحمه الله تعالى هكذا في العيون.

ولو اعطى بعض ولده شيئا دون البعض لزيادة رشده لا بأس به وان كانا سواء لا ينبغي ان يفضل.

ولو كان ولده فاسقا فاراد ان يصرف ماله الى وجوه الخير ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه لان فيه اعانة على المعصية ، ولو كان ولده فاسقا لا يعطي له اكثر من قوته.

( خلاصة الفتاوى : ٤/ ٤٠٠ )

وكذا نقله عنه العلامة ابن نجيم رحمه الله تعالى وقرره.

ونقل ايضا عن المحيط : يكره تفضيل بعض الاولاد على البعض في الهبة حالة الصحة الا لزيادة فضل له في الدين وان وهب ماله كله لواحد جاز قضاء وهو آثم. ( البحر الرائق : ٧/ ٢٨٨ )

وقال العلامة الطحطاوى رحمه الله تعالى : ( قوله وكذا في العطايا ) ويكره ذلك عند تساويهم في الدرجة كما في المنح والهندية اما عند عدم التساوى كما اذا كان احدهم مشتغلا بالعلم

لا بالكسب لا بأس ان يفضله على غيره كما في الملتقط اي ولا يكره

وفي الصحيح روي عن الامام انه لا بأس به اذا كان التفضيل لزيادة فضل

له في الدين وفي خزانة المفتين ان كان في ولده فاسق لا ينبغي ان

يعطيه اكثر من قوته كيلا يصير معينا له في المعصية انتهى وفي

الخلاصة ولو كان ولده فاسقا فاراد ان يصرف ماله الى وجوه الخير

ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه انتهى اي للولد وعلله في

البزازية بالعلة السابقة (قوله يسوي بينهم) قال في البزازية الافضل

في هبة البنت والابن التثليث كالميراث وعند الشافعي رحمه الله

تعالى التنصيف وهو المختار ولو وهب جميع ماله من ابنه جاز قضاء

وهو آثم نص عليه محمد رحمه الله تعالى اه افادات ترى نص البزازية

خاليا عن قصد الاضرار وقال في الخانية ولو وهب رجل شيئا لاولاده

في الصحة واراد تفضيل البعض على البعض في ذلك لا رواية لهذا في

الاصل عن اصحابنا وروي عن الامام رحمه الله تعالى انه لا بأس به

اذا كان التفضيل لزيادة فضل له في الدين وان كانا سواء يكره وروى

المعلى عن ابي يوسف رحمه الله تعالى انه لا بأس به اذا لم يقصد به

الاضرار وان قصد به الاضرار سوى بينهم يعطي الابنة مثل ما يعطي الابن

وقال محمد رحمه الله تعالى يعطي للذكر ضعف ما يعطي للانثى و

الفتوى على قول ابي يوسف رحمه الله تعالى.

(رد المحتار على الدر: ۳/۶۹۹، ماخوذ از احسن الفتاوی: ۷/۲۵۶)

## ہبہ سے رجوع کرنے کا حکم:

کسی کو کوئی چیز ہبہ کرنے کے بعد واپس لینے میں کئی قباحتیں ہیں، اس سے آپس میں بغض ونفرت پیدا ہوتی ہے، اس لئے یہ ایک مکروہ تحریمی عمل ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی شناعت وقباحت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"مثل الذي يعطي العطية ثم يرجع فيها كمثل الكلب اكل حتى اذا

## عمریٰ کے طریقہ پر ہبہ کرنے کا حکم:

ہبہ کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ "اعمرتک ھذہ الدار" وغیرہ الفاظ استعمال کرکے ہبہ کرے، جس کا معنی ہے کہ یہ گھر میں نے عمر بھر کے لئے تمہیں دیدیا، اب شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس کی تین صورتیں ہیں

(۱) ہبہ والا تصریح کرے کہ "اذا مت فھی راجعۃ الی او الی ورثتی" اس صورت میں بالاتفاق اس کا حکم عاریت کا ہے۔

(۲) ہبہ کے وقت تصریح کردے کہ "اذا مت فھی لورثتک بالعقب" اس صورت میں بھی اتفاق ہے کہ یہ ہبہ کے حکم میں ہے۔

(۳) ہبہ کے وقت صرف "اعمرتک" کہے یہ تصریح نہ کرے کہ "معمر لہ" کے مرنے کے بعد کیا صورت ہوگی، اس صورت میں اختلاف ہے، امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس صورت میں اس کو عاریت سمجھا جائے گا، امام شافعی رحمہ اللہ کا قول قدیم بھی یہی ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ فرماتے ہیں اس کو ہبہ قرار دیا جائے گا اور یہی امام شافعیؒ کا قول جدید ہے۔

لقولہ علیہ السلام: "العمریٰ جائزۃ"۔ (بخاری: ۲/۹۲)

وفی ملتقی الابحر قال: والعمریٰ جائزۃ للمعمر حال حیاتہ ولورثتہ بعدہ، وھی ان یجعل دارہ لہ مدۃ عمرہ فاذا مات ردت علیہ فالھبۃ صحیحۃ وشرط الرجوع الی الواھب شرط باطل، لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم: العمریٰ لمن وھبت لہ۔ (ملتقی الابحر: ۲/۱۰۵)

## حکم الرقبیٰ:

الرقبی ھی ان یقول شخص لآخر جعلت داری لک رقبی ان مت قبلی فھی لی، وان مت قبلک فھی لک، وکان کل واحد منھما یرتقب وینتظر موت الآخر ولذا سمیت "رقبی"۔

یعنی رقبیٰ کے معنی یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ میں نے اپنا مکان تمہارے لئے رقبیٰ کے طور پر دیدیا، اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے تو یہ مکان واپس میرا ہو جائے گا، اور اگر میں تم سے پہلے

منتقل ہو جائے تو یہ مکان ہمیشہ کے لئے آپ کا ہو گا، اب اس کے بعد گویا کہ ہر شخص دوسرے کی موت کا منتظر ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ امام شافعی، امام احمد اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا حکم بعینہ وہی ہے جو عمریٰ کا ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ عمریٰ میں تعلیق چھوڑ دے تو وہ ہبہ سمجھا جاتا ہے، اور رقبیٰ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ شخص پہلے مر جائے تو گھر رقبیٰ دینے کے پاس واپس لوٹ آتا ہے، اور اگر رقبیٰ دینے والے کا انتقال پہلے ہو جائے تو وہ مکان ہمیشہ کے لئے مرقب لہ کا ہو جاتا ہے، ان کا استدلال رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"الرقبی جائزة لاهلها۔"

اور رقبیٰ کا مفہوم اس زمانے میں یہی تھا، یہ رقب سے مشتق ہے اور ہر ایک دوسرے کی موت کا منتظر ہوتا تھا۔

لیکن امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام محمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے رقبیٰ باطل ہے کیونکہ یہ شرط فاسد ہے اور فساد کی وجہ جہالت ہے، باقی حدیث میں جس رقبیٰ کو جائز قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ "منکم لک رقبة هذه الدار" لہٰذا وہ ہبہ کے حکم میں ہے لہٰذا اب جو کوئی شخص رقبیٰ کرے گا وہ اسی معنی پر محمول ہو گا اور ہبہ سمجھا جائے گا۔

(ماخوذ از تقریر ترمذی شیخ تقی عثمانی زید مجدھم)

## ہبہ اور ہدیہ کو واپس کرنے کا حکم:

ہبہ اور ہدیہ کو رد کرنے کا حکم یہ ہے کہ اگر یقین یا ظن غالب ہو کہ حرام مال سے ہدیہ کر رہا ہے تو اس کو قبول کرنا جائز نہیں بلکہ واپس کرنا لازم ہے، اور اگر حلال مال سے ہدیہ کر رہا ہے لیکن رشوت کے طور پر ہو تب بھی قبول کرنا جائز نہیں، اس کے علاوہ ہو تو قبول کر لینا چاہئے، اور بدلہ میں ہدیہ کرنے والے کو بھی کوئی چیز ہبہ کرنی چاہئے۔

کما روت عائشة رضی الله عنها حیث قالت: "کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقبل الهدیة ویثیب علیها"۔

(اخرجه البخاری: ۲/۹۰، باب المکافاة فی الهدیة)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور اس پر بدلہ بھی دیتے

چاہئے۔

اگر ہدیہ دینے کے لئے کچھ نہ ہو تو "جزاک اللہ خیرا" کہہ دے یہ اس کے حق میں دعا اور اس کے لئے بہترین ہدیہ ہے۔

فقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من اسدى اليكم معروفا فكافئوه فان لم تجدوا ما تكافئونه به فادعوا له".

(الترغيب والترهيب للمنذري)

وقوله عليه السلام: "من صنع اليه معروفا فقال لفاعله: جزاك الله خيرا، فقد ابلغ في الثناء". (ترمذي بسند جيد)

## تین چیزوں کا ہدیہ رد نہ کرنا:

تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی چیز کسی کو ہدیہ کی جائے تو رد نہیں کرنا چاہئے۔

(۱) دودھ (۲) خوشبو (۳) تکیہ

لقوله عليه السلام: "من عرض عليه ريحان فلا يرده لانه خفيف المحمل، طيب الريح". (مسلم: رقم ۲۲۵۳)۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو ریحان ہدیہ میں ملے تو چاہئے کہ اس کو رد نہ کرے کیوں کہ اس کو اٹھانا آسان ہے اور اس کی خوشبو عمدہ ہے۔

وقوله عليه السلام: "ثلاثة لا ترد: الوسائد، والدهن، يعني الطيب، واللبن". (اخرجه الترمذي وقال حديث غريب)

وقال انس: "كان النبي صلى الله عليه وسلم لا يرد الطيب". (اخرجه البخاري: ۲/۱۰۹)

# احکام الودائع

## امانت کی حفاظت عاریت وغیرہ کے احکام:

هي ما يوضع عند غير صاحبه من مال ومتاع للحفظ والرعاية

وقال صاحب ملتقى الابحر: الايداع: تسليط المالك غيره على

حفظ ماله، والودیعة، مایترك عند الامین للحفظ .

(ملتقی الابحر : ۱۴۳/۲)

یعنی امانت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا مال کسی دوسرے شخص کے پاس بغیت حفاظت رکھوائے۔

## امین اور مودِع کے لئے شرائط:

امانت رکھوانے والے اور جس کے پاس رکھوایا گیا دونوں کا عاقل، بالغ اور تصرف کا اہل ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح ایجاب وقبول بھی ضروری ہے، یعنی امانت رکھوانے والا کوئی ایسا لفظ کہے جو امانت پر دلالت کرے، مثلاً عربی میں " او دعتك هذا المال ، يا احفظ هذا الشئ لی " یعنی یہ مال میں نے آپ کے پاس بطور امانت رکھا ہے یا میری اس چیز کی حفاظت کریں دوسرا شخص زبان سے ہاں کہے، یا خاموشی سے حفاظت پر راضی ہونے کو ظاہر کرے دونوں صورتوں میں امانت کا معاملہ مکمل ہو جائے گا۔

## امانت کی حفاظت کا حکم:

امانت قبول کرنے کے بعد اس کی حفاظت کرنا شرعاً واجب ہے، جس طرح اپنے ذاتی مال کی حفاظت کرتا، کہ خود حفاظت کرے یا بیوی بچے یا گھر کے کسی معتبر شخص کے ذریعہ حفاظت کرے، حفاظت کرنے کی پوری کوشش کے باوجود اگر ناگہانی آفت سے ہلاک ہو جائے یا چوری ہو جائے تو امین پر تاوان لازم نہ ہوگا اور اگر ان کی تعدی یا حفاظت میں کوتاہی کی وجہ سے ایسا ہوا تو تاوان لازم ہوگا۔

قال فی الاختیار هو عقد مشروع امانة لا غرامة لحدیث لیس علی المستودع غیر المغل، ای الخائن ضمان، ولا علی المستعیر غیر المغل ضمان . (دار قطنی) فهی امانة اذا هلکت من غیر تعد لم یضمن، لانه لو وجب الضمان ، لامتنع الناس عن قبولها، وفیه من الفساد مالا یخفی . (الاختیار لتعلیل المختار للموصلی : ۶۵/۳)

## امانت میں تصرف کا حکم:

امانت میں امین کے لئے تصرف کا حکم یہ ہے کہ چونکہ امین کے ذمہ امانت کی حفاظت لازم

ہے۔ لہذا حفاظت کے لئے جو تدبیر اختیار کرنا پڑے وہ تصرف کر سکتا ہے، اس کے علاوہ کسی قسم کا تصرف جائز نہیں۔

وفی الھندیہ قال: المودع لا یودع ولا یعیر ولا یؤجر ولا یرھن وان فعل شیئا منھن ضمن کذا فی البحر الرائق۔

(الفتاوی الھندیۃ: ۴/۳۳۸، کتاب الودیعۃ)

## امانت پر اجرت لینے کا حکم:

امانت کی حفاظت کو امین پر لازم کر کے اجرت مقرر کرنا شرعاً جائز ہے، البتہ اس صورت میں امین کے ہاتھ سے امانت کسی ایسے عمل سے ضائع ہو جائے جس سے بچنا ممکن تھا تو امین ضامن ہوگا ورنہ نہیں۔

وفی مجلۃ الاحکام: الودیعۃ امانۃ فی ید المودَع، فاذا ھلکت بلا تعد منہ وبدون صنعہ وتقصیرہ فی الحفظ لا یضمن ولکن اذا کان الایداع باجرۃ فھلکت او ضاعت بسبب یمکن التحرز عنہ لزم المستودع ضمانھا۔

(شرح المجلۃ مادۃ: ۷۷۷، احکام الودیعۃ)

## امانت رکھوا کر واپس نہ آئے:

اگر کوئی شخص امانت رکھوا کر واپس نہ آئے تو کچھ وقت انتظار کرنا ضروری ہے، اس میں اس کو تلاش کیا جائے اگر وہ مل جائے تو اس تک یا موت کی صورت میں اس کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے لیکن اگر بالکل پتہ نہ چلے تو اس مال کو امانت رکھوانے والے کی طرف سے صدقہ کر دے، امین اگر فقیر ہو تو خود بھی کھا سکتا ہے، صدقہ یا استعمال کے بعد مالک واپس آ جائے تو مالک کو اختیار ہوگا کہ اس صدقہ پر راضی رہے یا پھر امین سے اپنے مال کا مطالبہ کرے۔

قال العلامۃ الحصکفی رحمہ اللہ: فینتفع بھا لو فقیرا والا تصدق بھا علی فقیر ولو علی اصلہ وفرعہ وعرسہ، فان جاء مالکھا بعد التصدق خیر بین اجازۃ فعلہ ولو بعد ھلاکھا ولہ ثوابھا او تضمینہ۔ (رد المحتار: ۴/۲۷۹-۲۸۰، کتاب اللقطۃ)

## جوتے، کپڑے وغیرہ تبدیل ہو جانا:

اگر کسی شخص کی مسجد سے نکلتے وقت جوتے تبدیل ہو گئے یا جوتا یا اس میں بیگ وغیرہ تبدیل ہو گیا غلطی سے کسی دوسرے کا بیگ آگیا تو کیا اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس کا استعمال جائز نہیں کیوں کہ اولاً اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ یقین نہیں کہ جس نے جوتا لیا ہے یہ جوتا اسی کا ہے یا جو بیگ لے گیا ہے آپ کو ملا ہوا بیگ اسی کا ہے اور اگر ایسا ہو بھی تو بھی چونکہ باہمی مبادلہ کا کوئی معاملہ نہیں ہوا اس لئے جو جوتا یا کپڑا ملا ہے اس کا حکم لقطہ کا ہوگا، یعنی پہلے یہ کوشش کی جائے گی کہ اس کا مالک مل جائے اور اس کو واپس کر دیا جائے، ورنہ مالک کے ملنے سے مایوس ہو جائے تو مالک کی طرف سے صدقہ کردے، ہاں البتہ مالک ملنے سے مایوسی کی صورت میں اگر یہ شخص خود بھی مستحق زکوۃ ہو تو اس کو خود بھی استعمال کر سکتا ہے۔

كما في العالمكيرية قال: امرأة وضعت ملاءتها فجاءت امرأة أخرى ووضعت ملاءتها ثم جاءت الاولى وأخذت ملاءة الثانية وذهبت لا ينبغي للثانية أن تنتفع بملاءتها، والحيلة أن تتصدق الثانية بهذه الملاءة على ابنتها ان كانت فقيرة على نية أن يكون الثواب لصاحبتها ان رضيت ثم تهب الابنة الملاءة منها فيسعها الانتفاع بها كاللقطة، وكذا لو سرق مكعبا وترك عوضا.

(ماخوذ از امداد المفتین مفصل: ص ۸۷۶)

## سفر کے لئے روانگی کے وقت ہدایا کا رکھ لینا:

جب کوئی سفر سے وطن واپس آرہا ہوتا ہے تو دوسرے جانے والے اپنے عزیز واقارب کے لئے مختلف قسم کی چیزیں ان کے ہاتھ بھیجتے ہیں اب اس شخص کو اختیار ہے کہ یا تو شروع سے انکار کردے کہ میں ساتھ لے کر نہیں جا سکتا اور اگر انکار نہیں کرتا بلکہ اپنے ساتھ لے جانے کی حامی بھر لیتا ہے اور چیزیں قبول کر لیتا ہے تو اس صورت میں بعینہ وہی چیزیں جن کے لئے بھیجی ان تک پہنچانا ضروری ہے ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرنا حرام ہے، اگر رد و بدل کیا اس کے بعد وہ چیز ہلاک ہوئی تو تاوان ادا کرنا لازم ہوگا۔

## عاریت کی چیزیں امانت ہیں:

اگر کسی نے کوئی چیز بطور عاریت لی مثلاً مہمان آئے اور پڑوسی سے برتن وغیرہ لئے یا کبھی جاتا ہے کسی سے بیگ یا کوئی اور چیز بطور عاریت لی یہ امانت ہے، جس مقصد کے لئے لی ہے وہ مقصد پورا ہوتے ہی فوراً واپس کرنا ضروری ہے۔

## پڑوسی کے سالن کا برتن:

پڑوسی نے برتن میں سالن یا کوئی چیز بطور ہدیہ بھیجی تو چیز کو استعمال کرنے کے بعد برتن کو کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ برتن امانت ہے اور اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔

## مستعار کتب کا حکم:

مدرسے یا کسی سے کتاب عاریۃً حاصل کی اب اس کتاب پر لکھنا، حاشیہ چڑھانا یا کوئی اور تصرف کرنا جائز نہیں، بلکہ پڑھائی اور مطالعہ مکمل ہونے کے بعد واپس کرنا ضروری ہے۔

# احکام الرھن

## رہن کے احکام:

"الرھن فی اللغة معناه الحبس."

رہن کے معنی لغت میں روکنا ہے۔

وشرعاً "ما يحبسه الشخص وثيقة لدين الذي في ذمته لآخر، مثاله اذا اشترى متاعاً او سيارة، ولم يكن لديه ثمنها، فشرط عليه البائع بعض الحلي رهينة حتى يدفع ما عليه من دين أو يرهن ما يعادله مقابل الدين الذي استقرضه من آخر."

یعنی شرعاً رہن اس مال کو کہا جاتا ہے جو آدمی اپنے ذمہ واجب الاداء دین کے مقابلہ میں دائن کے پاس رکھواتا ہے تاکہ دین کی ادائیگی کا یقین حاصل ہو جائے، مثلاً کوئی سامان یا گاڑی خریدی لیکن قیمت کے لئے رقم اپنے پاس نہیں تو رقم کا بندوبست ہونے تک اپنی کوئی قیمتی چیز مثلاً سونا چاندی کے زیورات وغیرہ بائع کے پاس رہن رکھواتا ہے یا قرض حاصل کیا اس کی ادائیگی

مثلاً گھر یا کوئی دوسری چیز جو دائن کے پاس رکھواتا ہے۔

## رہن کی مشروعیت:

والرهن مشروع بالكتاب والسنة والإجماع ([illegible])

قال الله تعالى: وإن كنتم على سفر ولم تجدوا كاتبا فرهان مقبوضة (البقرة ٢٨٣)

وروى البخاري عن عائشة رضي الله عنها قالت: "اشترى رسول الله صلى الله عليه وسلم من يهودي طعاما ورهنه درعه ومات رسول الله صلى الله عليه وسلم ودرعه مرهونة عنده"

(بخاري كتاب الرهن ٢/٣٤٣، مسلم ٢/٣١)

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے غلہ خریدا اور اپنی زرہ مبارک اس کے پاس رہن رکھی اور رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے پردہ فرما گئے اس وقت بھی آپ کی زرہ مرہون تھی۔ (بخاری)

## رہن کی اصطلاحات:

راہن: مقروض شخص جو رہن رکھواتا ہے۔

مرتہن: قرض خواہ جو اپنے قرض کے عوض میں کسی کا مال اپنے پاس رہن رکھتا ہے۔

مرہون: وہ مال جو قرض کے عوض مرتہن کے قبضہ میں دیا جاتا ہے۔

## منافع رہن کا مالک راہن ہے:

یعنی مرہون اگرچہ مرتہن کے قبضہ میں رہتا ہے لیکن وہ راہن ہی کی ملک میں باقی رہتا ہے، اس کی حفاظت پر اگر کچھ خرچ آتا ہے یا وہ کوئی جانور ہو تو چارہ وغیرہ کا خرچہ مالک (یعنی راہن) کے ذمے ہوگا۔ اسی طرح اس کے منافع (پھل اور دودھ وغیرہ) بھی راہن کا ہوگا۔

لقوله عليه السلام: "الرهن من راهنه له غنمه وعليه غرمه."

(أخرجه الحاكم في المستدرك: ص ٢/٥١، والدارقطني: ٣/٣٢)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رہن پر راہن کی ملک باقی ہے، منافع کا وہ خود مالک

ہے اور خرچ بھی اسی کے ذمہ ہے۔

اگر راہن موجود نہ ہو اور مرتہن عدالت کے حکم سے مرہون پر کچھ خرچ کرے تو یہ راہن کے ذمہ قرض ہوگا اور اگر اپنی طرف سے خرچ کرے تو اس کی طرف سے تبرع و احسان ہوگا۔

## مرہون کے ضمان کا حکم:

احناف کے نزدیک شیٔ مرہون مرتہن کے قبضہ میں مضمون ہے یعنی دین کے بقدر پر مرتہن کا قبضہ، قبضۂ ضمانت ہے اور اس سے زائد اگر ہو تو اس پر مرتہن کا قبضہ، قبضۂ امانت ہے، لہذا اگر مرہون مرتہن کے ہاتھ میں ہلاک ہوا تو گویا مرتہن نے اپنا دین وصول کرلیا، وہ راہن سے قرض کے مطالبہ کا حقدار نہ ہوگا۔

مثلاً ہزار روپے قرض کے بدلے میں بارہ سو کی چیز رہن رکھی بعد میں مرہون ہلاک ہوگیا تو گویا کہ ہزار روپے کا قرض وصول ہوگیا اور اگر مرہون کی قیمت آٹھ سو روپے تھی تو اب مرتہن دو سو روپیہ راہن سے مطالبہ کرسکتا ہے۔

لقوله عليه السلام: "في رجل رهن فرسا، فنفق عند المرتهن اي هلك عنده، فجاء الى النبي صلى الله عليه وسلم فاخبره بذلك فقال له الرسول الله صلى الله عليه وسلم ذهب حقك"۔

(اخرجه البيهقي في السنن الكبرى: ٦/٤١)

ایک شخص کے پاس گھوڑا بطور رہن رکھا گیا اور مرتہن کے پاس گھوڑا ہلاک ہوگیا پس رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی تو آپ نے مرتہن سے فرمایا تمہارا حق ختم ہوگیا۔

## رہن کی زمین سے فائدہ حاصل کرنے کا حکم:

رہن سے فائدہ حاصل کرنا شرعاً ناجائز ہے اگر زمین رہن رکھی جائے تو اس سے مرتہن کے لئے انتفاع ناجائز ہونے کے متعلق ایک تفصیلی سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال:۔ زمین رہن رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو زمین مرتہن کے قبضہ میں رہے گی کہ راہن کے قبضہ میں رہے گی؟ اگر مرتہن کے قبضہ میں رہی تو مرتہن اس زمین کو کونسی صورت میں رکھے گا، آیا کہ زمین میں مرتہن خود تصرف کرے گا یا کہ یونہی چھوڑ دے گا؟ اسی وجہ سے بہت عرض کرتا ہوں کہ کونسی صورت پر رکھنے سے شرعاً حلال ہوسکتا ہے، بیان فرما کر بندہ کو مطمئن فرمائیں۔

الجواب: زمین رہن رکھنا جائز ہے اور دوسری اشیاء مرہونہ کی طرح زمین بھی مرتہن کے قبضہ میں رہے گی اور مرتہن کو اس میں تصرف کا حق نہیں ہے فقط امانت کے طور پر قبضہ میں رکھے نہ خود زراعت کرے نہ کسی کو کرایہ وغیرہ پر دے، اگر کرایہ پر زمین وغیرہ دی گئی تو دیکھا جائے کہ مالک کی اجازت سے دی گئی ہے یا بدون اجازت دی ہے؟ اگر اجازت سے دی ہے تو کرایہ مالک کا حق ہے اور رہن باطل ہو گیا اور مرتہن کو یہ حق نہیں رہا کہ اس کو بطور رہن روک رکھے اور اگر مرتہن نے بدون اذن مالک کرایہ پر دی ہے تو کرایہ (۱) لینے کا حق تو مرتہن کو ہے لیکن یہ کرایہ اس کے لئے حلال نہیں ہے، بلکہ واجب التصدق ہے (۲) اور رہن باقی ہے، اور اگر مرتہن نے خود زراعت کی ہے تو اگر اجازت راہن سے کی ہے تو اس پر ضمان کچھ نہیں لیکن یہ انتفاع ناجائز ہے، اور اگر بدون اجازت ہے تو نقصان کا ضمان لازم ہے۔

في العالمكيرية (٦/٢٨٣): ما يجوز بيعه يجوز رهنه.

وأيضاً في (ص ٤٩٩) اعلم بأن عين الرهن أمانة في يد المرتهن بمنزلة الوديعة الخ.

وأيضاً في الصفحة المذكورة: وإن آجر المرتهن من أجنبي بأمر الراهن يخرج من الرهن، وتكون الأجرة للراهن، وإن كانت الإجارة بغير إذن الراهن فالأجر للمرتهن يتصدق به، وللمرتهن أن يعيدها في الرهن، وقال أيضاً محمد بن جعفر وأبو حنيفة عن الراهن بعد ما انقضت مدة الإجارة صار غاصباً، هكذا في شرح الطحاوي وفي الدر المختار مع الشامي (٥/٥١٧) ثم نقل عن التهذيب أنه يكره للمرتهن أن ينتفع بالرهن وإن أذن له الراهن.

قال المصنف رحمه الله: وعليه يحمل ما عن محمد بن أسلم من أنه لا يحل للمرتهن ذلك ولو بالإذن، لأنه ربا، قلت: وتعليله يفيد أنها تحريمية، فتأمله.

---

(۱) یعنی زمین کی کمائی مالک کو نہیں ملے گی۔

(۲) یعنی یہ کرایہ فقراء پر صدقہ کر دینا واجب ہے۔

وفي تنقيح الحامدية المذكورة أيضا: وفيها (أي الجواهر) زرع المرتهن أرض الرهن بأن أبيح له الانتفاع لا يجب شيء وإن لم يبح لزمه نقصان الأرض وضمان الماء لو من قناة مملوكة فليحفظ.

وقال الشامي تحت (قوله: لو من قناة مملوكة) هذا خلاف المفتى به من أنه لا يضمن إلا ما ملكه بالإحراز كما مر في كتاب الشرب وماء القناة غير محرز.

یعنی مرتہن کو چاہیے کہ زمین وغیرہ کو بیکار رکھے۔

اور ایک صورت انتفاع کی یہ ہے کہ مرتہن ہی زمین کو راہن سے کرایہ پر لیکر خود زراعت کرے، اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر راہن کا قبضہ جو رہن کے وقت ہوا تھا اجارہ کے وقت رہے تو اجارہ صحیح نہیں ہوا اور اگر واپس کر کے دوبارہ قبضہ کیا تو اجارہ صحیح ہو گیا مگر رہن باطل ہو جائے گا۔

كما في العالمگیرية (٦/٢٩٩) وكذلك لو استأجره المرتهن صحت الإجارة وبطل الرهن إذا جدد القبض.

وفي الشامي (٥/٥٠٧) ويشترط في الإجارة (أي لصحة الإجارة وبطلان الرهن جميعا، وعلل في البدائع بأن قبض الرهن وقبض الإجارة متغائر فلا بد من قبض جديد للإجارة بتجديد القبض كما علمت اهـ انتهى. (ماخوذ از امداد الاحکام: ٣/٦٩٦)

## رہن سے فائدہ حاصل کرنے کا حکم:

رہن سے فائدہ حاصل کرنے کے متعلق چند سوالات وجوابات جن سے جزئیات کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں:

(۱) زمین باغ یا مکان وغیرہ رہن یعنی گروی اپنے پاس رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانا اور زمین گروی وغیرہ کی پیداوار کا حرام ہے یا نہیں؟

(۲) گروی چیز سے نفع حاصل کرنا سود ہے یا نہیں؟ اگر سود ہے تو اس سود کو حلال جاننے والے شخص کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

(۳) اور سود کو حلال جاننے والے کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

(۴) اگر وہی چیز کے منافع حرام ہونے یا سود ہونے میں علماء کا اتفاق ہے یا اختلاف بھی ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس کا؟ بینوا توجروا

الجواب: (۱) حرام ہے، اگر رہن اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مرتہن نفع حاصل کرے گا یا مشروط نہ ہو مگر معروف ہو جیسا کہ اس زمانہ میں ہے، یا بدون اجازت راہن کے نفع حاصل کرے۔

(۲) ہاں مرہون سے نفع اٹھانا سود ہے اور اسکو حلال سمجھنے والا فاسق ہے جبکہ انتفاع مشروط ہو یا بلا اذن ہو۔

(۳) اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

(۴) اگر انتفاع مشروط یا بلا اذن ہو تو انتفاع حرام ہے، اور معروف بھی بحکم مشروط ہے اگر معروف و مشروط نہ ہو اور بلا شرط و بلا عرف کے راہن اجازت دیدے تو جواز میں اختلاف ہے اور اگر بلا اذن انتفاع ہو تو وہ بھی انتفاع حرام ہے۔ (ماخوذ از امداد الاحکام)

## رہن کی ایک خاص صورت کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید و عمرو کے پاس ایک حصہ مفروزہ زمین کے مبلغ دو سو روپیہ کے مقابل میں رہن رکھا، اس شرط پر کہ مرتہن عمرو اس زمین مرہونہ سے نفع اٹھائے اور فی سال روپیہ مذکورہ سے پانچ روپیہ گھٹ جائے جس وقت راہن چاہے کہ زمین مذکورہ کو خلاص کرے تو زمین تو باقی روپیہ دیکر خلاص کر سکتا ہے، مثلاً دو سال کے بعد اگر راہن زمین مذکورہ کو خلاص کرنا چاہے تو ایک سو نوے 190 روپیہ دے کر خلاص کرے۔

**خلاصہ:**

راہن اور مرتہن نے زمین مرہونہ کے خلاص کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی تو یہ صورت رہن میں شرعاً جائز ہوگی یا نہیں؟ بر تقدیر ثانی سود ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب: یہ صورت جائز نہیں۔

ولا یتاویل انه بحسب الربا قیمة لمنافع السنة كلها لكونه بیع

ما لم یوجد.

اور اگر کسی نے سود کا حیلہ بنانے کی نیت سے یہ صورت اختیار کی تو اس کی اس نیت کا بھی گناہ ہوگا۔ (حوالہ بالا)

## مرہون کے اجارہ کا حکم:

اگر راہن مرہونہ زمین مرتہن کو کرایہ پر دیدے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس مسئلہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ اجارہ ایک جائز معاملہ ہے، مالک اپنی زمین، اجارہ کی تمام شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے کرایہ پر دے سکتا ہے، چاہے مرتہن کو دے یا کسی غیر کو، لیکن جب مالک اور مستأجر کے درمیان پہلے رہن کا معاملہ ہو چکا، اب مرتہن کو کرایہ پر دینے کی وجہ سے عقد رہن کا معاملہ ختم ہو جائے گا، لہٰذا اجارہ کا معاملہ ختم ہونے پر قرض ادا کئے بغیر زمین اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے، مرتہن کے لئے انکار کی گنجائش نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: اما الاجارة فالمستأجر ان كان هو الراهن فهي باطلة، وان هو المرتهن وجدد القبض للاجارة بطل الرهن والاجرة للراهن.

(رد المحتار: ٦/ ٥١١، كتاب الرهن)

## رہن کو فروخت کرنے کا حکم:

اگر قرض ادا کرنے کی مدت پوری ہو جائے تو راہن پر لازم ہے کہ قرض ادا کر دے اور اپنا رہن چھڑا لے، اگر قرض ادا نہ کرے تو حاکم اس کو قرض ادا کرنے پر مجبور کرے گا، اگر قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو رہن کو فروخت کر دیا جائے گا، اگر رہن کی قیمت قرض سے زائد ملے تو زائد حصہ مالک (راہن) کو دیا جائے گا اور اگر قیمت کم ملے تو وہ بعد میں راہن سے وصول کیا جائے گا۔

## غلق الرہن کا حکم:

عرب میں اسلام سے پہلے دستور تھا کہ قرض کی مدت پوری ہونے پر راہن اپنا رہن نہ چھڑوائے تو مرتہن اس پر قبضہ کر لیتا اور اپنی مرضی سے تصرف کرتا چاہے اس کی قیمت مقدار قرض سے کتنی ہی زیادہ ہو، تو اسلام نے اس دستور کو مٹایا اور باطل طریقہ پر لوگوں کے مال کھانے سے منع فرمایا:

كما في الحديث: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لا يغلق الرهن لصاحبه غنمه وعليه غرمه"

(أخرجه ابن ماجه: ٢/٨١٦)

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ راہن، رہن چھڑانے سے عاجز ہونے کی صورت میں مرتہن کو رہن پر قبضہ کر لینے کا حق نہ ہوگا، بلکہ راہن ہی اس کا مالک رہے گا البتہ اس کو رہن فروخت کر کے قرض چکانے پر مجبور کیا جائے گا۔

# احکام الغصب

## غصب کے احکام:

الغصب لغة: أخذ الشيء ظلماً مجاهرة على وجه القهر.

کسی کے مال کو زبردستی ظلماً چھین لینا۔

كما في قوله تعالى: ﴿وكان وراءهم ملك يأخذ كل سفينة غصبا﴾ (سورة الكهف: ٧٩)

اصطلاحاً: أخذ مال متقوم، محترم مملوك للغير بطريق التعدي. (كتاب الاختيار للموصلي: ٣/٥٨)

## غصب کرنا بہت بڑا گناہ ہے:

کسی کا مال ناحق کھانا بہت بڑا ظلم اور گناہ ہے۔

قوله: ﴿لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم﴾ (سورة النساء: ٢٩)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

وقوله عليه السلام: "من أخذ شبراً من الأرض ظلماً طوقه الله من سبع أرضين". (أخرجه البخاري: ٢/٦٨)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ناحق کسی کی ایک بالشت زمین غصب کر لی

الله تعالى يوم الانقطاع ورجحه قهستاني ويجب قيمته في القيمي يوم غصبه اجماعا.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: (قوله ورجحه) أي قول أبي يوسف وقول محمد رحمهما الله تعالى وكذا الأول بمعمول بهما أي كما رجح قول الإمام محمد رحمه الله تعالى عند المتون المعول عليه وصرح بذلك القهستاني بانه الأصح كما في المضمرات وهو الصحيح كما في التحفة وعند أبي يوسف يوم الغصب وقول محمد أعدل الأقوال كما قال المصنف وهو المختار على ما قال صاحب النهاية وعند محمد يوم الانقطاع وعليه الفتوى كما في ذخيرة الفتاوى وبه أفتى كثير من المشايخ. (رد المحتار، ج ٦، ص ١٨٢)

## بلا اجازت بیوی کی زمین میں تصرف کرنے کا حکم:

اس بارے میں ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے تا کہ مسئلہ کی وضاحت ہو جائے۔

سوال: زوجہ کی زمین میں اگر شوہر مکان بنالے تو یہ کس کا ہوگا؟ آیا زوجہ کا یا شوہر کا؟

بینوا توجروا

جواب: اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں

(۱) بیوی کے لئے اس کے اذن سے مکان بنایا تو مکان بیوی کا ہوگا اور جو مصارف آئے وہ بیوی پر قرض ہوں گے۔

(۲) بیوی کے لئے بلا اذن بنایا تو تبرع شمار ہوگا۔

(۳) شوہر نے اپنے لئے بیوی کی اجازت سے بنایا تو زمین بیوی کی رہے گی اور مکان شوہر کا۔

(٤) بیوی کی اجازت کے بغیر اپنے لئے بنایا تو مکان شوہر کا ہوگا مگر بیوی اس کو اکھاڑ کر اپنی زمین خالی کرانے کا مطالبہ کر سکتی ہے، اگر مکان گرانے میں زمین کا ضرر ہو تو بیوی مکان کی قیمت دے کر مکان کی مالک بن سکتی ہے، قیمت ایسے مکان کی لگائی جائے گی جس کے گرانے کا فیصلہ کیا جا چکا ہو ملبہ کی قیمت سے شاید کچھ زیادہ متفاوت نہ ہوگی۔

بعض لکھتے ہیں کہ ملکیت ہو جانے سے حرمت صحت کی سبب ہو جاتی ہے، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ امید ہے کہ اس مسئلہ کو بہت اچھی طرح سے مع دلائل تحریر فرمائیں گے؟

الجواب: اگر اس نے دوسرے کی زمین غصب کی ہو تب تو وہ اس زمین سے مالدار نہیں ہو سکتا، لیکن زمین مغصوبہ میں غاصب جو کاشت وغیرہ کرے گا، وہ کھیتی اور اس کا منافع غاصب کی ملک ہے گو ملک خبیث ہے اگر کھیتی اور پیداوار کی آمدنی مقدار زکوٰۃ و مقدار حج کو پہنچ جائے تو اس کے ذمہ زکوٰۃ اور حج سب فرض ہے اور زمین مغصوب منہ کی ملک ہے اور غاصب کے ذمہ اس زمین کے استعمال کرنے کی اجرت واجب ہے، یعنی عرفاً جس قدر لگان کاشتکاروں سے زمیندار لیا کرتے ہیں، وہ اس کو دینا واجب ہے نیز اس سے معافی چاہنا بھی واجب ہے کیوں کہ اس نے بدون اجازت کے اس کی زمین کو استعمال کیا۔ جب تک غاصب ایسا نہ کرے دوسروں کو اس کی آمدنی سے دعوت قبول کرنا حرام ہے۔ اور اگر غاصب نے زمین غصب نہیں کی بلکہ روپیہ غصب کیا اور اس روپیہ سے زمین خریدی تو یہ زمین غاصب ہی کی ملک ہے، روپیہ والے کی ملک نہیں، لیکن جب تک غاصب مغصوب منہ کا روپیہ ادا نہ کرے اس وقت تک زمین اس کی ملکیت خبیث ہے، لیکن جب یہ زمین کا مالک ہے تو اس پر اس کی آمدنی میں زکوٰۃ و حج وغیرہ کی فرضیت ضرور ہوگی۔ (بشرطیکہ آمدنی اس قدر ہو جائے کہ مغصوب منہ کی رقم ادا کرنے کے بعد بھی مقدار نصاب مقدار حج باقی رہے) اس صورت میں غاصب کے ذمہ مغصوب منہ کا روپیہ ادا کرنا واجب ہے اور وہ روپیہ اس کے ذمہ قرض ہے۔ زمین میں مغصوب منہ کا کوئی حق نہیں، زمین غاصب ہی کی ملکیت ہوگی، لیکن اگر غاصب اس کا روپیہ ادا نہ کرے تو وہ بعد حکم حاکم کے زمین بھی اپنے روپیہ کے معاوضہ میں لے سکتا ہے۔

یہ تو ملکیت کا حکم تھا، رہا دوسروں کا اس کے یہاں کھانا کھانا، دعوت قبول کرنا، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر غاصب کی آمدنی اسی زمین سے ہے جس کو اس نے غصب کے روپیہ سے خریدی تب تو لوگوں کو اس کا کھانا کھانا حرام ہے، اور اگر دوسری آمدنی بھی ہے اور حلال آمدنی حرام پر غالب ہے، تو دعوت قبول کرنا فتوی سے جائز ہے، مگر تقوی کے خلاف ہے، جب تک یہ شخص غصب کو واپس نہ کردے۔

{ماخوذ از امداد الاحکام}

## بلا اجازت کسی کے جانور ذبح کرنا:

اگر ضرورت کی وجہ سے کسی کے جانور کو اس نیت سے ذبح کرے کہ بعد میں قیمت ادا کر دوں گا تو شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ جانور مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کرنا غصب کے حکم میں ہے، لہٰذا مالک کو دو باتوں کا اختیار ہوگا۔ چاہے تو ذبح شدہ جانور غاصب کے حوالے کر کے اس سے پورے سالم جانور کی قیمت وصول کرے، اور اگر چاہے تو ذبح شدہ جانور رکھ لے اور ذبح کی وجہ سے سالم جانور کے مقابلہ میں قیمت میں جو کمی واقع ہوئی ہے وہ غاصب سے وصول کرے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: قال في العمادية في فصل ٣٢ ومن ذبح شاة غيره فمالكها بالخيار إن شاء ضمنه قيمتها وسلمها إليه وإن شاء أخذها وضمنه نقصانها.

(تنقيح الحامدية ٢/١٧٥ كتاب الغصب،
مختصر فتاوى خانية على هامش الهندية ٣/٢٤٥)

## مغصوبہ زمین کے منافع کا حکم:

اگر کوئی زمین غصب کر کے منافع حاصل کرتا رہا اور منافع کا کچھ حصہ خود استعمال کرتا رہا کچھ رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کرتا رہا، چند سالوں کے بعد زمین اصل مالک کو واپس کر دی تو اب تک کے منافع کا کیا حکم ہوگا؟ کیا اصل مالک کو حق ہوگا کہ گذشتہ سالوں کے پیداواری منافع کا مطالبہ کرے؟

تو یاد رہے کہ شرعاً کسی کا مال غصب کرنا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا حرام ہے، دوران غصب میں جو کچھ بھی مغصوب شے سے حاصل ہوا ہے وہ مغصوب منہ کا حق ہے، لہٰذا اپنی مغصوبہ زمین کی جملہ پیداوار کا مطالبہ کر سکتا ہے، اسی طرح مغصوبہ زمین کی بازیابی کے بعد مساجد و دیگر رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کی ہوئی رقم کی واپسی کا بھی مطالبہ کر سکتا ہے، نیز علاقے کے عرف کے مطابق غاصب کو اجرت مثل دینا لازم ہوگا۔

وفي الهندية: وسئل شيخ الإسلام عطاء بن حمزة عمن زرع أرض انسان ببذر نفسه بغير إذن صاحب الأرض هل لصاحب الأرض

ان يطالبه بحصة الارض قال نعم ان جرى العرف في تلك القرية انهم يزرعون الارض بحصة الخارج او ربعه او نصفه او خمسه يقضى بالشائع يجب ذلك القدر الذي جرى به العرف.

(الفتاوى الهندية، ج ٥، ص ٢٤٤، باب العاشر في زراعة الارض المغصوبة)

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: فتحصل ان من زرع ارض غيره بلا اذنه ولو على وجه الغصب فان كانت الارض ملكا واعتاد ربها المزارعة اعتبر العرف في الحصة ان كان ثمة عرف والا فان كان ممن لا يعطي الخارج كله للزارع وعليه اجر مثلها لربها والا فان انتقصت فعليه النقصان والا فلا شيء عليه.

(تنقيح الحامدية: ٢/١٧٢، كتاب الغصب، بحث في المنافع المكاسبة، ص ٢٠٩، كتاب الغصب)

## ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کا حکم:

اگر ڈاکو کسی کا مال چھیننا چاہے تو صاحب مال کو شرعاً حق حاصل ہے کہ مدافعت کرکے اپنے مال کو بچانے کی کوشش کرے البتہ یہ کوشش کرے کہ معمولی مدافعت سے کام چل جائے، لیکن اگر مدافعت میں قتل وقتال کی بھی نوبت آجائے تو شرعاً اس کی بھی اجازت ہے کیوں کہ انسان کی جان، مال اور عزت تینوں شریعت کی نگاہ میں محترم ہیں، ان کی حفاظت کے لئے قتال جائز ہے۔

كما في حديث اخرجه مسلم رقم ١٤٩: "كل المسلم على المسلم حرام، دمه وماله وعرضه."

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون بہانا، مال لوٹنا، عزت کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔

مدافعت کرتے ہوئے ڈاکو مارا جائے تو جہنمی ہوگا اور صاحب مال مارا جائے تو شہید ہوگا۔

عن ابي هريرة رضي الله عنه انه قال: جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال يا رسول الله أرأيت ان جاء رجل يريد

أخذ مالي قال فلا تعطه مالك، قال أرأيت إن قاتلني، قال قاتله قال أرأيت إن قتلني قال فأنت شهيد، قال أرأيت إن قتلته قال هو في النار" (أخرجه مسلم: رقم ١٤٠)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے بتائیے کہ کوئی شخص میرا مال مجھ سے چھیننا چاہے تو میرے لئے کیا حکم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنا مال اس کو مت دو، پھر دوبارہ عرض کی کہ اگر وہ مجھ سے قتال کرے تو میں کیا کروں؟ فرمایا تو بھی قتال کر، پھر عرض کیا اگر وہ مجھے قتل کر دے تو کیا ہوگا، ارشاد فرمایا کہ تو شہید ہوگا عرض کیا کہ اگر میں اس کو قتل کر دوں تو کیا ہوگا، ارشاد فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

وفي الحديث الصحيح: من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دمه أي دفاعاً عن نفسه فهو شهيد، ومن قتل دون أهله أي دفاعاً عن عرضه فهو شهيد.

(أخرجه أبو داؤد، ٤٧٧٢، والترمذي: ١٤٢١ وقال حسن صحيح، فقه المعاملات)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے اور جو شخص اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے۔ (ترمذی، ابوداؤد)

## غصب شدہ مال کسی کے پاس مل جائے اس کا حکم:

اگر اپنا غصب شدہ مال کسی کے پاس صحیح حالت میں مل جائے تو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ اس سے واپس لے لے اگر چہ اس نے غصب کرنے والے سے خریدا ہو، کیوں کہ جس وقت غاصب وہ مال فروخت کر رہا تھا اس مال کا مالک نہیں تھا لہٰذا یہ بیع منعقد ہی نہیں ہوئی لہٰذا مالک اپنا مال اسی طرح واپس حاصل کرلے باقی یہ شخص غاصب سے ادا کردہ قیمت واپس لے لے۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من أدرك ماله بعينه عند رجل أو إنسان قد أفلس فهو أحق به من غيره.

(اخرجه البخاري ۲/۱۰۸۵، باب اذا وجد ماله عند مفلس فهو احق به)

وجاء في حديث آخر: من وجد عين ماله عند رجل فهو احق

به، ويتبع البيع من باعه، اي يرجع مشتري على من باعه المتاع

يسترد الثمن منه. (اخرجه ابوداؤد والنسائي، فقه المعاملات)

## غصب در غصب کا حکم:

ایک شخص نے دوسرے کا مال غصب کیا پھر دوسرے ڈاکو نے اس پر ڈاکہ ڈالا، مثلاً کسی کی گاڑی تھی ایک شخص اس سے چھین کر لے گیا لیکن دوسرے ڈاکو نے اس سے چھین لیا پھر اس کے ہاتھ سے ٹوٹ گئی یا کسی وجہ سے قابل استعمال نہیں رہی تو مالک کو شرعاً حق حاصل ہے کہ اس کے خلاف مقدمہ دائر کرکے دونوں میں سے جس سے چاہے ضمان وصول کر سکتا ہے۔

لو غصب شخص متاع انسان أو سيارته فجاء شخص آخر فغصب هذا المتاع من الغاصب أو اغتصب السيارة أو الدابة، ثم هلك في يده ضمن بمضمن هذا المغصوب اتفق فقهاء المذاهب الاربعة على أن المالك بالخيار ان شاء ضمن الغاصب الاول لو جود فعل الغصب منه فهو المتعدي الاول وان شاء ضمن الغاصب الثاني.

(فقه المعاملات)

# احکام اللقطة

## معمولی چیزوں کا حکم:

اگر کسی کو گمشدہ چیز مل جائے اور وہ ایسی حقیر چیز ہے کہ مالک خود اس کو تلاش نہیں کرے گا، مثلاً ایک کھجور یا ایک روپیہ یا ایک پیاز یا کوئی انگور کا دانہ، خیال بھی ہے کہ یہ اللہ کی نعمت یوں ہی ضائع ہو جائے گی تو اسکو اٹھا کر کسی کو دیدے یا خود استعمال کرلے۔

كما في رواية البخاري عن انس رضي الله عنه انه قال "مر النبي صلى الله عليه وسلم بتمرة في الطريق فقال لولا اني اخاف ان تكون من الصدقة لاكلتها".

(اخرجه البخاري: ٢٤٣١، باب اذا وجد تمرة في الطريق)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کسی راستے پر گذر ہوا ایک کھجور پڑی ہوئی ملی تو ارشاد فرمایا کہ اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ یہ کھجور صدقہ کی ہے تو میں اس کو اٹھا کر کھا لیتا۔

وعن جابر رضي الله عنه قال: "رخص لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم في العصا والسوط والحبل وأشباهه يلتقطه الرجل ينتفع به". (اخرجه ابوداؤد واحمد)

## کوئی قیمتی چیز پڑی ہوئی ملنے کا حکم:

اگر کوئی قیمتی چیز پڑی ہوئی مل جائے، اور اس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ مالک خود ہی واپس آکر اٹھا لے گا، تو چھوڑ دی جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ اگر میں نے نہیں اٹھایا تو ضائع ہو جائے گی، یا کوئی خائن شخص یا چور اٹھا لے گا، یا مالک تک نہیں پہنچ پائے گی ایسی صورت میں حفاظت کی نیت سے اٹھانا واجب ہے۔

كما في كتاب الاختيار قال: اللقطة اسم للمال الملتقط وأخذها أفضل لئلا تصل إليها يد خائنة، وإن خاف ضياعها فواجب أخذها صيانة لحق الناس عن الضياع، وإن يخاف على نفسه الطمع فيها وترك التعريف والرد، فالترك أولى، وهي أمانة في يد الملتقط.

(الاختيار لتعليل المختار: ٣/٣٢)

## لقطہ کی تعریف اعلان کرنا واجب ہے:

اگر کوئی پڑی ہوئی چیز حفاظت کی نیت سے اٹھا لے تو اس پر واجب ہے کہ ہر ممکن طریقے سے اس کا اعلان کرے، مساجد کے دروازے پر یا بازاروں میں اعلان لگائے، اخبارات میں اشتہار شائع کرے، اگر مالک مل جائے اور علامات سے یقین یا ظن غالب حاصل ہو جائے کہ یہی شخص اس چیز کا مالک ہے تو اس کے حوالے کر دینا لازم ہے، اگر حوالے نہیں کیا تو یہ شخص غاصب شمار ہوگا انکار کے بعد اگر ہلاک ہو جائے تو ضمان لازم ہوگا۔

عن زيد بن خالد الجهني أن النبي صلى الله عليه وسلم سئل عن اللقطة فقال: اعرفها سنة فإن جاء أحد يخبرك بها، الى قوله:

والا فاستنفقها. (صحیح البخاری: ۲/۳۶۳)

## لقطہ کے استعمال کا حکم:

ملی ہوئی چیز کے بارے میں ہر ممکن طریقہ سے اعلان کرنے کے باوجود مالک نہ ملے تو شرعاً لازم ہے کہ اس کو فقراء پر صدقہ کردے اگر عزیز و اقارب میں سے کوئی فقیر ہو مثلاً والدین بھائی بہن وغیرہ تو ان پر صدقہ ہو سکتا ہے اسی طرح دیگر فقراء و مساکین پر بھی، خود اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

أورد المنذري في الحديث: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (الترغيب والترهيب)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "کسی مسلمان کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں" ہاں البتہ اگر وہ خود فقیر ہو تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے۔

## ملی ہوئی چیز صدقہ کرنے کے بعد مالک نکل آئے:

اگر اعلان کے بعد مالک نہیں ملا اس لئے صدقہ کر دیا یا فقیر ہونے کی بناء پر خود استعمال کر لیا اس کے بعد مالک نکل آیا تو اب مالک کو اختیار ہوگا کہ صدقہ پر راضی رہے یا اٹھانے والے سے تاوان وصول کرے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: فينتفع بها لو فقيرا وإلا تصدق بها على الفقير ولو على أصله وفرعه وعرسه فإن جاء مالكها بعد التصدق خير بين إجازة فعله ولو بعد هلاكها فله ثوابها أو تضمينه. (رد المحتار: ۴/۲۷۹، كتاب اللقطة)

## حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ریل کے ذریعہ سفر فرما رہے تھے سیٹ پر جلوہ فرما تھے اور بھی تھے قریب میں ایک مسافر سیٹ پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا، اس کے ہاتھ سے ایک بوٹی گر گئی اس نے جوتی سے اس کو سیٹ کے نیچے کر دیا، حضرت نے جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری ہو رہی ہے اور یہ نعمت ضائع ہو رہی ہے تو اس کو اٹھایا اور ایک رفیق سفر سے فرمایا کہ اس کو پانی سے دھو لیں چنانچہ جب اس کو دھو کر صاف کر لیا تو حضرت نے خود

جائے۔

قال الامام المرغيناني رحمه الله : وينبغي ان يعرفها في الموضع الذي اصابها وفي المجامع ، فان ذلك اقرب الى الوصول الى صاحبها . ( هداية : ١ / ٦١٤ )

وقال الشيخ محمد زكريا كاندهلوي رحمه الله : واما مكانه وهو الاسواق وابواب المساجد والجوامع في الوقت الذي يجتمعون فيه كادبار الصلوٰة في المساجد وكذلك في مجامع الناس لان المقصود اشاعة ذكرها ، واظهارها ليظهر عليها صاحبها فيجب تحري مجامع الناس ولا ينشدها في المساجد لان المسجد لم يبن لهذا . ( اوجز المسالك : ١٣/ ٢٩٨ )

## لاوارث بچہ کا حکم:

اگر کوئی بچہ مل جائے، اس کو نہ اٹھانے کی صورت میں ضائع ہونے یا مرنے کا خوف نہ ہو تب بھی اٹھالینا مستحب ہے، اور اگر ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اٹھانا واجب ہے نہ اٹھایا اور بچہ مر گیا تو یہ شخص گناہ گار ہوگا۔

قال في الاختيار : التقاط صغار بني آدم مفروض ، ان علم انه يهلك ان لم يأخذه بان كان في مفازة ، صحراء ، أو بئر أو ارض مسبعة ، دفعًا للهلاك عنه ، فان غلب على ظنه دفع الهلاك ، بأن كان في مصر ، أو قرية ، فأخذه مندوب ، لما فيه من السعي في احياء نفس محترمة . ( الاختيار لتعليل المختار : ٣/ ٤٩ )

## لاوارث بچہ کا نان نفقہ:

لاوارث بچہ کا نان نفقہ سرکاری بیت المال کے ذمہ ہے، حکومت کی طرف سے اس کا صحیح انتظام نہ ہونے کی صورت میں عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کی دیکھ بھال، پرورش اور تعلیم وتربیت کا انتظام کرے۔

وانما وجبت نفقته في بيت المال لانه لاولي له ، والسلطان ولي

من لا ولي له، فينفق عليه من بيت المال، لأن ماله يكون لبيت المال عند الوفاة فيكون الغرم بالغنم. (فقه المعاملات)

وقال في كتاب اعلاء السنن: وإذا فرض الإمام نفقته من بيت المال، ثم أنفق الملتقط عليه شيئا من نفسه لحاجة اللقيط إليه ونوى الرجوع فيه أن يرجع في نفقته ولم يكن متبرعاً.

(اعلاء السنن: ۱۳۱/۳)

## مسلمانوں کے لاوارث بچوں کو کافروں کی پرورش میں نہ دیا جائے:

مسلمانوں کے لاوارث بچوں کی پرورش مسلمانوں ہی کی ذمہ داری ہے اگر کوئی کافر انفرادی طور پر مسلمان لاوارث بچوں کی پرورش کرنا چاہے یا کسی ادارہ کی شکل میں مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کرنا چاہے تو شرعاً یہ جائز نہیں، کیوں کہ کسی کافر کی تربیت میں پرورش پاکر اس کا مسلمان باقی رہنا بہت ہی مشکل ہے، لہٰذا مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ سرکاری سطح پر یا غیر سرکاری سطح پر ایسے ادارے وجود میں لائیں جن میں ایسے بچوں کی دینی طور پر تربیت ہو سکے کافروں کے حوالے کرنا ایمانی غیرت کے خلاف ہے اور ناجائز ہے۔

ليس للكافر التقاط طفل مسلم، لأنه لا ولاية لكافر على مسلم، ولأنه لا يؤمن أن يفتنه ويعلمه الكفر بل الظاهر أنه يربيه على دينه وينشأ على ذلك فيصبح كافراً، لأن تأثير الوالد على الولد كبير فهو سبب لإيمانه أو كفره، كما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كل مولود يولد على الفطرة فأبواه يهودانه، أو ينصرانه، أو يمجسانه.

(أخرجه البخاري في كتاب القدر)

## لاوارث بچہ کا مسلمان یا کافر ہونا:

جو لاوارث بچہ مسلمانوں کے علاقہ میں مل جائے وہ مسلمان سمجھا جائے گا، اور اس کی پرورش کا حقدار مسلمان ہوگا جو بچہ کافر ذمیوں کے علاقہ میں پایا جائے وہ ذمی ہوگا، کوئی ذمی اگر اس کی پرورش کرنا چاہے تو اس کو دے دیا جائے، ورنہ مسلمان ہی پرورش کرے، امید ہے کہ بڑا ہو کر مسلمان ہی ہوگا، یہ اس کے لئے ابدی سعادت کا ذریعہ بنے گا۔

كما في ملتقى الابحر نقلا عن المبسوط قال : واذا وجد اللقيط في مصر من امصار المسلمين ، أو في قرية من قراهم فهو مسلم وإن وجد في قرية من قرى اهل الذمة او في بيعة او كنيسة كان ذميا .

(ملتقى الابحر : ١/ ٣٨٠)

## لاوارث بچے کے نسب کا حکم:

لاوارث بچہ مجہول النسب ہوگا، خود سے اس کو کسی کی نسبت کرنا صحیح نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کے نسب کا دعویدار بن کر آئے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اس سے نسب ثابت ہوگا یہ اس مدعی کا بچہ کہلائے گا، اس میں بچہ کا فائدہ ہے تعلیم وتربیت کے علاوہ اس سے بغیر باپ کے ہونے کا عار بھی دور ہو جائے گا، اگر کئی دعویدار بن کر آئے تو جس کے پاس گواہ موجود ہوگا اسی کو دیا جائے گا۔

فاذا ادعى انسان نسبة اللقيط اليه ، فتصح دعواه ويثبت النسب منه ، ولو من غير بينة ، حرمة للطفل ، لانه يتشرف بالنسب ويتعير بفقده ، وبهذه الدعوى يثبت انه ابوه ، فيكون احق بولده ، وله أن ينتزعه من الملتقط .

(انظر الاختيار : ٣/ ٣٠ ، ملتقى الابحر : ١/ ٣٨٠)

## سیلاب میں بہتی ہوئی چیزوں کا حکم

اگر کوئی چیز سیلاب میں بہتی ہوئی آجائے ، لکڑی ، برتن اور کوئی کھانے پینے اور پہننے کی چیز تو شرعاً اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں تفصیل ہے ، جو چیز سیلاب میں بہہ کر آتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

(۱) معمولی چیز جن کی کوئی اہمیت نہ ہو کہ مالک ان کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے ، تو ان کی تشہیر واعلان کی ضرورت نہیں ویسے ان کو استعمال کر سکتے ہیں ، ہاں البتہ مالک آکر مطالبہ کرے تو دینا پڑے گی۔

(۲) قیمتی چیزیں جن کی مالک تلاش کرے ، اگر ایسی چیزیں ملیں تو ان کا اعلان اور تشہیر ضروری ہے ، مالک کا انتظار کیا جائے اگر مالک کے آنے کی توقع نہ ہو ، یا ان کے بگڑنے کا خطرہ ہو تو کسی غریب پر صدقہ کر دیا جائے ، خود اگر حاجت مند ہو تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے لیکن اگر مالک

وقت موجود وارثوں پر تقسیم ہوگا، نوے برس کی عمر ہونے سے پہلے اپنے مال میں زندہ ہے لہذا اس زمانہ میں کوئی شخص اس کے مال میں دخیل کار نہیں ہوسکتا اور غیر کے مال میں جب سے مفقود ہوا اس وقت سے مردہ متصور ہوگا یعنی اگر کوئی شخص اس کے مفقود ہونے کے بعد مرگیا تو یہ مفقود اس کا وارث نہ ہوگا اگرچہ مفقود کی عمر ابھی تک نوے برس نہ ہوئی ہو مگر چوں کہ غیر کے مال میں بھی مردہ ہونے کا حکم نوے برس کی عمر کے بعد ہی ظاہر ہوتا ہے، اس سے پہلے اس کے واپس آکر وارث بن جانے کا احتمال ہے اس لئے اس میت کے مال سے مفقود کا حصہ امانت رکھا جائے گا، اگر واپس آگیا تو اس کو مل جائے گا ورنہ نوے برس عمر ہو جانے کے بعد جس میت کے مال سے امانت رکھا تھا اسی کے وارثوں پر لوٹا دیا جائے گا، جو میت کے انتقال کے وقت زندہ تھے موجودہ وارثوں کا اعتبار نہیں اور نہ ہی مفقود کے وارثوں کا اس میں کوئی حق ہے۔

قال العلامة التمرتاشي رحمه الله تعالى: هو (اى المفقود) غائب لم يدر أحي هو فيتوقع أم ميت أودع اللحد البلقع وهو في حق نفسه حي فلا ينكح عرسه غيره ولا يقسم ماله (الى قوله) وميت في حق غيره فلا يرث من غيره ولا يستحق ما أوصى له اذا مات الموصي بل يوقف قسطه الى موت أقرانه في بلده على المذهب فان ظهر قبله حيا فله ذلك وبعده يحكم بموته في حق ماله يوم علم ذلك فتعتد عرسه للموت ويقسم ماله بين من يرثه الآن وفي مال غيره من حين فقده فيرد الموقوف له الى من يرث مورثه عند موته.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: (قوله وهو في حق نفسه حي) مقابله قوله الآتي وميت في حق غيره وحاصله انه يعتبر حيًّا في حق الاحكام التي تضره وهي المتوقفة على ثبوت موته ويعتبر ميتاً فيما ينفعه ويضر غيره وهو ما يتوقف على حياته لان الاصل انه حي والى الآن كذلك استصحاباً بالحال السابق والاستصحاب حجة ضعيفة تصلح للدفع لا للاثبات اى تصلح لدفع ماليس بثابت لا لاثباته. (رد المحتار: ٣/٣٢٨)

وقال ایضاً: (قوله علی المذهب) وقیل یقدر بتسعین سنة بتقدیم التاء من حین ولادته واختاره فی الکنز وهو الارفق هدایه وعلیه الفتوی.

(رد المحتار: ۳/۳۳۱، ماخوذ از احسن الفتاوی: ۹/۳۰۸)

## زوجۂ مفقود کا حکم:

سوال: شریعت مطہرہ کا حکم اس بارہ میں کیا ہے؟ کہ ایک شخص مدت سے غائب اور لاپتہ ہے اس کی موت یا زندگی کی کوئی خبر نہیں، ایسی حالت میں اس کی بیوی کے لئے دوسری جگہ نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: مفقود کی بیوی کے لئے بہتر ہے کہ شوہر کی عمر نوے برس ہونے تک صبر کرے، اگر صبر نہ کر سکے تو ایسی مجبوری میں مذہب مالکی کے مطابق یہ عورت کسی حاکم مسلم کے ہاں دعویٰ پیش کرے اور گواہوں سے مفقود کے ساتھ تا حال قیام نکاح حاکم کے پاس ثابت کرے، نکاح کے اصل شاہد ضروری نہیں بلکہ شہادت بالسماع کافی ہے، یعنی نکاح کی عام شہرت سن کر نکاح پر شہادت دی جاسکتی ہے، اس کے بعد شوہر کے مفقود ہونے کی شہادت شرعیہ پیش کرے، پھر حاکم اس شخص کی بقدر ممکن تلاش کرے جہاں اس کے جانے کا ظن غالب ہو وہاں آدمی بھیجے، اور جہاں صرف احتمال ہو خطوط وغیرہ سے تحقیق کرے اخبار میں اشتہار دے یا مفید معلوم ہو تو یہ بھی کر لے، بہر کیف ہر ممکن صورت سے اس کی تلاش میں پوری کوشش کرے، حاکم کے پاس دعویٰ پیش ہونے سے قبل عورت کی طرف سے یا کسی دوسرے شخص کی طرف سے تلاش کی کوشش کافی نہیں، بلکہ دعویٰ پیش ہونے کے بعد ضروری ہے کہ حاکم خود پوری کوشش کرے، دوسروں کے کہنے پر ہرگز اعتبار نہ کرے، جب حاکم شوہر کے ملنے سے بالکل ناامید ہو جائے تو عورت کو چار سال کی مہلت دے، اگر ان چار سالوں میں بھی اس کی کوئی خبر نہ آئی تو عورت حاکم کے پاس دوبارہ درخواست پیش کر کے نکاح فسخ کروائے، اور شوہر کو مردہ تصور کر کے عدت موت چار ماہ دس دن گذار کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے، اگر کہیں حاکم مسلم موجود نہ ہو یا وہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرتا ہو تو جماعۃ المسلمین بطریق مذکور فسخ نکاح کا فیصلہ کر سکتی ہے مگر اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں۔

(1) جماعت کے ارکان کم از کم تین ہوں۔

(2) سب ارکان عادل متقی پرہیزگار ہوں۔

(3) سب ارکان باعمل از کم ایک رکن ایسا عالم ہو جو شہادت وقضاء کے احکام شریعت کا ماہر ہو۔

(4) فسخ نکاح کا فیصلہ سب ارکان اتفاق رائے سے کریں۔

(5) شوہر کی تلاش کے وقت مصارف عورت خود برداشت کرے، اگر وہ عاجز ہو تو حکومت برداشت کرے۔

اگر دوسری جگہ نکاح کرنے کے بعد پہلا شوہر آ گیا تو اس کے احکام یہ ہیں:

(1) یہ عورت اسی پہلے شوہر کو ملے گی، تجدید نکاح کی بھی ضرورت نہیں، پہلا نکاح ہی کافی ہے۔

(2) اگر دوسرے شوہر نے خلوت صحیحہ کی ہو تو کل مہر دے گا، اور عورت پر عدت طلاق واجب ہوگی، اگر خلوت صحیحہ نہ ہوئی تو نہ مہر واجب ہوگا نہ عدت۔

(3) عدت پہلے شوہر کے پاس گذارے گی، مگر عدت گذارنے تک پہلے شوہر سے جماع کرنا جائز نہیں۔

(4) اگر دوسرے شوہر سے حسب نکاح میں یا فسخ نکاح کے بعد عدت گذرنے سے قبل اولاد پیدا ہوگی تو یہ دوسرے شوہر کی ہوگی۔

وهذا ملخص ما هو مشروح في الحيلة الناجزة للحيلة العاجزة.

**تنبیہ:**

حیلہ ناجزہ میں جہاں نکاح پر شہادت کا ذکر ہے اس سے صرف انعقاد نکاح مراد نہیں بلکہ قیام نکاح پر شہادت ضروری ہے۔

ما في الرواية الأولى من العلامة سعيد بن صديق الملاني: ما نصه بعد أن يثبت الزوجية وغيبة الزوج والبقاء في العصمة إلى الآن اهـ وفي الإلحاق من العلامة الهاشمي فإن الزوجة تثبت بشاهدين أن فلاناً زوجها وغاب عنها اهـ وفي الرواية الثالثة والعشرين من العلامة العلاقي كلها إثبات الزوجية اهـ. فقط والله تعالى أعلم

**فائدہ:**

ہم دستخط کنندگان ذیل کے نزدیک مناسب یہ ہے کہ حیلہ ناجزہ (ص ۔۔۔ ۶۱) میں بعنوان "فائدہ" جو الفاظ لکھے گئے ہیں ان کو مندرجہ ذیل الفاظ میں تبدیل کر دیا جائے۔ زوجہ مفقود کے لئے قاضی کی عدالت میں فسخ نکاح کی درخواست کے بعد جو مزید چار سال کے انتظار کا حکم دیا گیا ہے یہ اس صورت میں ہے کہ عورت کے لئے نفقہ اور گذارہ کا بھی کچھ انتظام ہو اور عصمت وعفت کے ساتھ یہ مدت گذارنے پر قدرت بھی ہو، اور اگر اس کے نفقہ اور گذارہ کا کوئی انتظام نہ ہو، نہ شوہر کے مال سے نہ کسی عزیز وقریب یا حکومت کے تکفل سے اور خود بھی محنت ومزدوری پردہ اور عفت کے ساتھ کر کے اپنا گذارہ نہیں کر سکتی، تو جب تک صبر کر سکے شوہر کا انتظار کرے جس کی مدت ایک ماہ سے کم نہ ہو اس کے بعد (۱) قاضی یا کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں فسخ نکاح کا دعویٰ دائر کرے۔

اور اگر نفقہ اور گذارہ کا تو انتظام ہے مگر بغیر شوہر کے رہنے میں اپنی عفت وعصمت کا اندیشہ قوی ہے تو سال بھر صبر کرنے کے بعد (۲) قاضی کی طرف مرافعہ کرے اور دونوں صورتوں میں گواہوں کے ذریعہ یہ ثابت کرے کہ (۳) اس کا شوہر فلاں اتنی مدت سے غائب ہے اور اس (۴) نے اس کے لئے کوئی نان نفقہ نہیں چھوڑا، اور نہ کسی کو نفقہ کا ضامن بنایا اور اس نے اپنا نفقہ اس کو معاف بھی نہیں کیا، اور اس پر عورت حلف بھی کرے اور دوسری صورت یعنی عفت کے خطرہ کی حالت میں قسم کھائے کہ میں بغیر شوہر کے اپنی عفت قائم نہیں رکھ سکتی، قاضی کے پاس جب یہ ثبوت مکمل ہو جائے تو قاضی اس کو کہہ دے کہ میں نے تمہارا نکاح فسخ کر دیا یا شوہر کی طرف سے طلاق دیدی یا خود عورت کو اختیار دیدے کہ وہ اپنے نفس پر طلاق واقع کرے اور جب عورت طلاق اپنے پر واقع کرے تو قاضی اس طلاق (۵) کو نافذ کر دے۔

---

(۱، ۲) [illegible]

محمد شفیع عفا اللہ عنہ — رشید احمد — محمد عاشق الٰہی عفا اللہ عنہ

خادم دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴ — محمد رفیع عثمانی — محمد تقی عثمانی

(۳) [illegible] (۴) [illegible]

(۵) [illegible]

(كما في فتوى العلامة الشامي من الالحاق الحيلة الناجزة، ص ۱۱۰)

## شوہر بحری سفر میں گم ہو گیا:

سوال: ایک شخص بحری سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لانچ پر سوار ہو کر حج سے واپس آ رہا تھا، رات کو لانچ کے ایک طرف تختہ پر جو تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا تھا اس پر سویا ہوا تھا، ساتھیوں نے اور ناخدا نے بھی منع کیا مگر باز نہ آیا، صبح اٹھے تو یہ شخص مفقود تھا۔ اب اس کے مال اور بیوی کا شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

جواب: قرائن سے اس کی موت متیقن ہے لہٰذا اس کا ترکہ تقسیم کر دیا جائے، اور اس کی بیوی عدت موت گزار کر دوسرا نکاح کر سکتی ہے، قرائن مفیدہ یقین بحکم شہادت ہیں۔

كما في كتاب الدعوى من شرح التنوير ونصه وقطعها بقرينة قاطعة كأن ظهر من دار خالية إنسان خائف بسكين متلوث بدم فدخلوها فورا فرأوا مذبوحا لحينه أخذ به إذ لا يمتري أحد أنه قاتله (رد المحتار: ٤/٥٨٧) وفي الشامية في أول كتاب القضاء في بيان طريق القاضي إلى الحكم: أو القرائن الواضحة التي تصير الأمر في حيز المقطوع به فقد قالوا لو ظهر إنسان من دار بيده سكين وهو متلوث بالدم سريع الحركة عليه أثر الخوف فدخلوا الدار على الفور فوجدوا فيها إنسانا مذبوحا بذلك الوقت ولم يوجدوا أحدا غير ذلك الخارج فإنه يؤخذ به وهو ظاهر إذ لا يمترى في أنه قاتله والقول بأنه ذبحه آخر ثم تسور الحائط أو أنه ذبح نفسه احتمال بعيد لا يلتفت إليه إذ لم ينشأ عن دليل. (رد المحتار: ٤/٤٣١)

شامیہ کتاب المفقود میں جو مذکور ہے کہ سفر بحر میں گم ہونے والے کا مدت طویلہ تک انتظار کر کے حاکم اس کی موت کا حکم کرے گا اس سے وہ شخص مراد ہے جس کے ساحل پر پہنچنے کا علم نہ ہو، صورت سوال میں تو وسط بحر ہی میں فقدان کا علم ہو گیا ہے جو موجب یقین ہے اور احتمال بعید ناشی بلا دلیل کا اعتبار نہیں۔

كما صرح به شارح التنوير وابن عابدين رحمهما الله تعالى فيما

ذكرنا من نصهما .

ایسا بعید احتمال تو بالشفقت میت کے دیکھنے کے بعد بھی موجود ہوتا ہے کہ شاید موت نہ ہو بلکہ سکتہ ہو لہٰذا اس صورت میں شدت سے مزید کسی انتظار کی ضرورت ہے اور نہ تعلیم خاص کی۔

(ماخوذ از احسن الفتاوی : جلد ۵)

وقال علي رضي الله عنه لا يحق للزوجة فسخ الزواج وتنتظر حتى تعلم احي ام ميت . (اخرجه عبد الرزاق في المصنف)

وهذا مذهب الجمهور في المفقود الذي لا يغلب هلاكه كالذي يخرج للحج او لطلب العلم او التجارة .

وقال عمر رضي الله عنه : ايما امرأة فقدت زوجها فلم تدر اين هو؟ فانها تنتظر اربع سنين ، ثم تعتد اربعة اشهر وعشرا ، ثم تحل الى التزوج . (رواه عنه البخاري والشافعي)

وهذا مذهب مالك والشافعي في المفقود الذي يغلب هلاكه ، كفقيد البحر ، والمعركة ، فانه في الغالب يكون قد استشهد ، ان لم يرجع الى اهله في اربع سنين . (فقه المعاملات)

# عہدۂ قضاء کے احکام

عہدۂ قضاء کا مقصد ہے ملکی باشندوں کو انصاف فراہم کرنا، ہر ظالم کو انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کرنا اور مظلوم کی داد رسی کرنا، یہ انسان کی اجتماعی زندگی کا حصہ لازمی ہونے کے علاوہ عظیم عبادت بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو بعثت انبیاء کے مقاصد میں داخل فرمایا۔

كما يقول الله جل شانه : ﴿لقد ارسلنا رسلنا بالبينت وانزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط﴾

(سورة الحديد : ۲۵)

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

انصاف فراہم کرنا اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا اہم ترین عبادت ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے جن سات خوش نصیبوں کو قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ ملنے کی بشارت دی ان میں ایک امام عادل بھی ہے۔

كما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "سبعة يظلهم الله تحت ظل عرشه يوم لا ظل الا ظله امام عادل" (الحديث اخرجه البخاري ومسلم، وانظر نص الحديث بكامله. (مسلم: ۷۱۵/۱)

وقال تعالى لخاتم الانبياء والمرسلين ﴿فاحكم بينهم بما انزل الله ولا تتبع اهواءهم عما جاءك من الحق﴾ (سورة المائدة: ۴۸)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: پس آپ ان کے باہمی معاملات میں اسی بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ کرا اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجئے۔

## اسلام میں پہلا قاضی:

دین اسلام میں قضاء کا فریضہ سب سے پہلے سرور کائنات ﷺ نے انجام دیا، صحابہ کرام اپنے معاملات کا فیصلہ کروانے کے لئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، آپ ﷺ ان میں انصاف قائم فرماتے تھے، مظلوم کی دادرسی فرماتے، ظالم کو ظلم سے روکتے تھے، حتیٰ کہ یہود مدینہ بھی اپنے مقدمات کا فیصلہ آپ ﷺ سے کرواتے تھے، امت کو عدالت اسلامی سے آگاہ کرکے انصاف کرنا بھی آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری تھی۔

بقوله تعالى ﴿انا انزلنا اليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما اراك الله ولا تكن للخائنين خصيما﴾ (سورة النساء: ۱۰۵)

بے شک ہم نے آپ کے پاس کتاب بھیجی ہے واقع کے موافق تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتادیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ فیصلہ فرمانے سے پہلے فریقین کو وعظ فرماتے، غلط دعویٰ کرکے مال چھینے اور اس کے استعمال حرام ہونے کے بارے میں ڈراتے تھے۔

كقوله عليه السلام: "انما انا بشر وانكم تختصمون الي ولعل بعضكم ان يكون الحن بحجته فاقضي له على نحو ما اسمع

اس عہدہ کو قبول کرے اور انصاف فراہم کرنے کا فریضہ انجام دے تو سب کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

اگر کوئی بھی اس عہدہ کو قبول نہ کرے تو سب گناہ گار ہوں گے اگر کسی شہر میں اس منصب کے قابل ایک ہی شخص موجود ہو اور کوئی دوسرا نہیں تو شرعاً اس کے ذمہ لازم ہے کہ اس عہدہ کو قبول کرے اور انصاف قائم کرے۔

## قاضی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت:

جب قاضی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے، جب قاضی ظلم کرنے لگتا ہے اور خلاف شرع فیصلہ کرتا ہے، شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔

کما جاء فی الحدیث انہ علیہ السلام قال: " ان اللّٰہ مع القاضی مالم یجر ای یظلم فاذا جار تخلی اللّٰہ عنہ ولزمہ الشیطان."

(ترمذی: ۱۳۳۰، کتاب الاحکام وقال حدیث حسن)

## عہدۂ قضاء کا طالب ہونا خطرناک ہے:

جو شخص شرعی احکام سے ناواقف ہو اور حق وباطل کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، صرف منصب اور دنیا کمانے کی لالچ میں قضاء کے عہدہ پر فائز ہوتا ہے اور پھر خلاف شرع فیصلہ کرتا ہے رشوت لے کر ظالم کی حمایت کرتا ہے، ایسے شخص کے لئے بہت بڑی تباہی ہے، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

" من ولی القضاء فقد ذبح بغیر سکین."

یعنی جس نے قضاء کا منصب قبول کیا گویا کہ اس کو بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔

(ابو داؤد، ترمذی: ۱۳۲۵)

## قاضی کی تین قسمیں:

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: " القضاۃ ثلاثۃ واحدۃ فی الجنۃ واثنان فی النار، فاما الذی فی الجنۃ فرجل عرف الحق فقضیٰ بہ، ورجل عرف الحق فجار فی الحکم، فھو فی النار، ورجل قضی

للناس على جهل فهو في النار."

(أخرجه أبو داؤد رقم: ٣٥٧٣، والترمذي رقم: ١٣٢٢، والحاكم وصححه)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قاضی کی تین قسمیں ہیں، ایک جنت میں جائے گا اور دوسرا جہنم میں:

(۱) جنت میں جانے والا قاضی وہ ہے جو حق کو جان کر انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے۔

(۲) وہ قاضی جو حق کو جاننے کے باوجود ظلم کرے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔

(۳) جو قاضی حق و باطل کے درمیان تمیز کی اہلیت نہ رکھتا ہو اس لئے غلط فیصلہ کرتا ہے وہ بھی جہنمی ہے۔

## عہدۂ قضاء باعث حسرت ہے:

قاضی اگر انصاف فراہم نہ کر سکے یا اپنے بارے میں خطرہ ہو کہ اس منصب کو قبول کرنے کے بعد جادۂ حق پر قائم نہیں رہ سکوں گا اس پر لازم ہے کہ اس عہدہ کو قبول کرنے سے اجتناب کرے۔

كما جاء في الحديث: عن أبي ذر رضي الله عنه أنه قال، قلت يا رسول الله! ألا تستعملني؟ فقال يا أباذر، إنك ضعيف وإنها أمانة، وإنها يوم القيامة خزي وندامة إلا من أخذ بحقها وأدى الذي عليه فيها. (أخرجه مسلم رقم: ١٨٢٥)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ مجھے قضاء کا عہدہ عطا نہیں فرماتے؟ تو ارشاد فرمایا کہ اے ابوذر! تم اس ذمہ داری کو اٹھانے کے متحمل نہیں ہو کیوں کہ یہ ایک امانت ہے اور یہ قیامت کے دن ندامت اور شرمندگی کا باعث ہے، ہاں البتہ کوئی شخص اہلیت کا حامل ہو وہ اس عہدہ کو قبول کرے اور پھر اسکا حق ادا کرے تو اور بات ہے۔ (مسلم)

"وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ابتغى القضاء وسأل فيه شفعاء، أي وسط من يوصله إلى القضاء، وكل إلى نفسه، ومن أكره عليه أنزل الله عليه ملكا يسدده."

(اخرجه الترمذي في كتاب الاحكام رقم: ۱۳۲٤، وقال هذا حديث حسن غريب)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص عہدۂ قضاء کا طلب گار ہو اور اس عہدہ کو حاصل کرنے کے لئے سفارش کا ذریعہ کوشش کرے اور اس عہدہ پر فائز ہو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوتی بلکہ اسکو ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے ہاں البتہ جس کے اندر اہلیت ہو اور اس کی طلب کے بغیر اس کو یہ منصب دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی تائید اور مدد کے لئے ایک فرشتہ مقرر فرماتے ہیں جو اس کی مدد کرتا ہے۔

## عہدۂ قضاء سے انکار کا ایک واقعہ:

بڑے بڑے علماء اور فقہاء قضاء کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کرتے تھے اس خوف سے کہ کہیں فیصلہ کرنے میں کسی فریق پر ظلم نہ ہو جائے، نیز ایسا نہ ہو کہ سلاطین وقت کے دباؤ میں آ کر کہیں خلاف شرع فیصلہ کرنا پڑ جائے، چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ جب قاضی شریح کو مصر کے قضاء کا عہدہ پیش کیا گیا تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، تو والی مصر نے ان کو قتل کی دھمکی دی کہ اگر یہ عہدہ قبول نہ کیا تو قتل کر دیا جائے گا، جب شریح نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور امیر کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ یہ میرے گھر کی چابی ہے یہ لے لیں کیونکہ اب میں اپنے رب سے ملنے کا خواہش مند ہوں، چنانچہ جب امیر نے حضرت شریح رحمہ اللہ کے اس عزم کو دیکھا تو انہیں چھوڑ دیا۔ (فقه السنة: ٣/٤٠٠)

اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ جس شخص کو فیصلہ کے وقت ظلم صادر ہونے کا خوف ہو اس کے حق میں عہدۂ قضاء قبول کرنا مکروہ ہے۔

## قاضی بننے کی شرائط:

قاضی کے اندر بنیادی طور پر ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

١ ... اسلام

٢ ... عقل

٣ ... بلوغ

٤ ... احکام شرع سے واقف ہو۔

٥ ... اعضاء و جوارح صحیح سالم ہوں اور متوازن مزاج کا مالک ہو۔

پر جو حاکم کافر اپنی مرضی سے کسی مسلمان کو قاضی مقرر کر دے تو مسلمان قاضی کے لئے کافر حاکم کی طرف سے عہدہ قضا قبول کرنا جائز ہے۔ عہدۂ قضا قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قرآن وحدیث کے مطابق کرے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: ذكر في أول جامع الفصولين: كل مصر فيه والٍ مسلم من جهة الكفار يجوز منه إقامة الجمع والأعياد وأخذ الخراج وتقليد القضاء وتزويج الأيامى لاستيلاء المسلم عليهم، وأما طاعة الكفرة فهي موادعة ومخادعة، وأما في بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمع والأعياد ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين ويجب عليهم طلب والٍ مسلم اهـ وقدمنا نحوه في باب الجمعة عن البزازية.

(رد المحتار: ۴/۱۷۵، قبيل باب العشر والخراج)

## حاکم اور قاضی کے لئے آداب:

قاضی اور حاکم کو چاہئے کہ مندرجہ ذیل باتوں کی پابندی کرے۔

(۱) حسن خلق کو اپنائے، نیز وقار بھی ہو کہ کسی کام میں ایسی جلد بازی نہ کرے جو اس کے ہلکے پن یا غصے سے مغلوب ہونے پر دلالت کرے، فریقین میں سے کسی کے ساتھ ہنسی مذاق نہ کرے، نہ کوئی ایسی بات کرے جو کم سمجھ کے لوگوں کی ہوتی ہے، نیز فریقین میں سے کسی کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے۔

(۲) عمدہ لباس اختیار کرے جو اہل فضل علماء کا لباس ہے۔

(۳) دونوں فریق کو ایک نظر سے دیکھے، دونوں کو ایک طرح کی نشست پر بٹھائے، کسی ایک طرف زیادہ نہ جھکے۔

(۴) جب تک فریقین کی بات سن نہ لے فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرے۔

(۵) کسی ایک فریق کو دلیل کی تلقین نہ کرے، نہ ہی گواہی کا طریقہ سکھائے۔

(۶) عزیز و اقارب کے علاوہ کسی ایسے شخص سے ہدیہ قبول نہ کرے کہ بعد میں مقدمہ فیصلہ کرتے وقت ہدیہ کی وجہ سے ان کی رعایت کرنی پڑے، خصوصاً مقدمہ کے دونوں فریق میں سے

کسی ایک سے ہدیہ قبول کرنا رشوت کے حکم میں ہے اس سے اجتناب لازم ہے۔

(ہدایہ ۳/۱۹۴)

(۷) عمومی دعوت کے علاوہ کسی شخص کی خاص دعوت قبول نہ کرے جو محض قاضی صاحب کی خاطر کر رہا ہو۔

(۸) جنازہ میں حاضر ہوا کرے، بیماروں کی عیادت کرے، کیوں کہ یہ حقوق المسلمین میں داخل ہے۔

" قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: حق المسلم علی المسلم ست، قیل ما ھن یا رسول اللہ، قال اذا لقیتہ فسلم علیہ واذا دعاک فاجبہ، واذا استنصحک ای طلب النصیحۃ فانصح لہ واذا عطس فحمد اللہ فشمتہ، واذا مرض فعدہ، واذا مات فاتبعہ "

(اخرجہ مسلم فی کتاب السلام رقم ۲۱۶۲)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں آپ ﷺ عرض کیا گیا یا رسول اللہ (ﷺ) وہ حقوق کیا ہیں تو فرمایا

(۱) جب کسی مسلمان سے ملاقات ہو تو اس کو سلام کیا جائے۔

(۲) وہ دعوت کرے تو اس کو قبول کرے۔

(۳) اگر وہ نصیحت طلب کرے تو اس کو نصیحت کرے۔

(۴) چھینکنے کے بعد الحمد للہ کہے تو سننے والا یرحمک اللہ کہے۔

(۵) جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے۔

(۶) جب انتقال کر جائے تو جنازہ میں حاضر ہو اور قبرستان تک ساتھ چلے۔

(مسلم)

(۹) قاضی کو چاہیے کہ فیصلہ کے وقت شریعت کی مکمل پابندی کرے۔

(۱۰) فیصلہ کے وقت ہر اس بات سے دور رہے جو اس کے دل کو مشغول کرے فکر کو مشوش کرے، لہذا غصہ کے وقت یا خوف کے وقت یا بھوک کی حالت میں یا پیشاب پاخانے کے تقاضے کے وقت فیصلہ نہ کرے۔

كما روى في الحديث : لا يقضين حكم بين اثنين وهو غضبان ( أخرجه البخاري في الأحكام رقم : ٧١٥٢ )

قال ابن دقيق العيد : وقد قاس الفقهاء على الغضب كل ما يحصل به تغير الفكر كالجوع ، والعطش المفرطين وغلبة النعاس ، وسائر ما يتعلق به القلب ، تعلقاً يشغله عن استيفاء النظر ، وهو قياس مظنة . ( نقلاً عن منتقى الابحر : ٢ / ٧١ )

## حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک اہم خط:

ولعلنا ندرك أهمية القضاء ومكانة القضاء في الاسلام ، والمنهج الذي ينبغي أن يسلكه الحاكم في حكمه ، من تلك الرسالة العظيمة التي أرسلها الفاروق "عمر" رضي الله عنه الى "أبي موسى الأشعري" وفيها النموذج الأكمل والدستور المحكم ، الذي ينبغي أن يسير عليه القضاة في جميع العصور والأزمان ، فقد جاء في تلك الرسالة ما يلي :

" بسم الله الرحمن الرحيم ، من عبد الله عمر بن الخطاب أمير المؤمنين الى " عبدالله بن قيس " اسم " أبي موسى الأشعري " سلام الله عليك .

أما بعد : فان القضاء فريضة محكمة ، وسنة متبعة ، فافهم اذا أدلي اليك ، فانه لا ينفع كلام بحق لا نفاذ له ، آس أي ساو بين الناس في وجهك وعدلك ومجلسك ، حتى لا يطمع شريف في حيفك ، أي ميلك معه لشرفه ، ولا ييأس ضعيف من عدلك .

البينة على من ادّعى ، واليمين على من أنكر ، والصلحُ جائز بين المسلمين ، الا صلحاً أحل حراماً ، أو حرّم حلالاً .

لا يمنعك قضاءٌ قضيت به اليوم فراجعت فيه عقلك ، وهديت فيه لرشدك ، أن ترجع الى الحق ، فان الحق قديمٌ ، ومراجعةُ الحق خيرٌ

من تمادی فی الباطل.

الفهم الفهم فيما تردّد في صدرك مما ليس في كتاب ولا سنة،
ثم اعرف الأشباه والنظائر، وقس الأمور عند ذلك، واعمد إلى أقربها إلى الله وأشبهها بالحق. المسلمون عدول بعضهم على بعض، إلا مجلودا في حد أو مجربا عليه شهادة زور، أو ظنينا في ولاء أو نسب، فإن الله تولّى منكم السرائر، ودرأ عنكم بالبيّنات والأيمان المغلظة[1]
وإياك والغلق والضجر، والتأذي بالخصوم، والتنكّر عند الخصومات، فإن الحق في مواطن الحق يعظّم الله به الأجر، ويحسن به الذخر، فمن صحّت نيّته، وأقبل على نفسه، كفاه الله ما بينه وبين الناس، ومن تخلّق أي أظهر للناس بما يعلم الله أنه ليس من نفسه، شانه الله، أي أبغضه الله وأهانه، فما ظنك بثواب من عند الله عزّ وجلّ، في عاجل رزقه، وخزائن رحمته، والسلام.

هذه وصية أمير المؤمنين عمر بن الخطاب رضي الله عنه إلى أحد قضاته، وهي تفيض صدقا، وإخلاصا، وروعة وبيانا، لسلوك الطريق الأمثل، في فصل الخصومات بين الناس، ليسعد الناس في حياتهم، ويأمنوا على أموالهم وأرواحهم، في ظل شريعة الله العادلة[2]. (فقه المعاملات)

## قاضی سے فیصلہ میں غلطی صادر ہونے کا حکم:

قاضی کے اندر قضاء کی اہلیت موجود ہے اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی مکمل کوشش کی، لیکن اس کے باوجود غلطی سے کوئی خلاف شرع فیصلہ ہوگیا اور فریق حقدار کے بجائے دوسرے کو دلا دیا تو ایسی صورت میں قاضی عند اللہ مجرم نہیں ہوگا۔

"عن عمرو بن العاص رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا اجتهد الحاكم فأصاب فله الأجران، وإن اجتهد

فاخطأ فله اجر"۔

(اخرجه البخاري في كتاب الاعتصام رقم: ٧٣٥٢، ومسلم رقم: ١٧١٦ في الاقضية)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی حاکم اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرے اور درست فیصلہ ثابت ہو تو ان کو دو اجر ملیں گے اور اگر خطا اجتہادی واقع ہو جائے تب بھی ایک اجر ملے گا۔

(بخاری و مسلم)

لیکن یاد رہے کہ یہ ایسے قاضی کے لئے ہے جو قضاء کے اصول وضوابط سے مکمل واقف ہو احکام شرع کا استحضار رکھتا ہو اس کے باوجود معاملہ سمجھنے میں غلطی واقع ہوئی تو یہ حکم ہے۔

## قاضی کے غلط فیصلے سے حرام حلال نہیں ہوتا:

فقہاء امت کا اس پر اجماع ہے کہ قاضی اگر جھوٹی شہادت سن کر کسی کے حق میں غلط فیصلہ کر دے یہ قضاء ظاہراً تو نافذ ہے، اس لئے مدعی علیہ کے ذمہ لازم ہوگا کہ مال مدعی کا حوالہ کر دے لیکن باطناً عنداللہ یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، مدعی کے لئے اس مال کو لینا حرام ہوگا، اس کا استعمال بھی حرام ہوگا، اگر لے لیا تو واپس کرنا لازم ہے، کیوں کہ قاضی کے فیصلہ کر دینے سے حرام حلال نہیں ہوتا۔

لما قال صلى الله عليه وسلم: انما انا بشر، وانكم تختصمون الي ولعل بعضكم الحن بحجته من بعض، فاقضي بنحو ما اسمع فمن قضيت له من حق اخيه شيئاً فلا يأخذه، فانما اقطع له قطعة من النار. (بخاري رقم ٦٨/٢، مسلم ١٧١٣، كتاب الاقضية)

وهذا الحديث حجة قاطعة على أن حكم القاضي لا يحل الحرام حلالاً، فالشخص المبطل مؤاخذ ومعذب عند الله حتى ولو حكم له القاضي، ولهذا قال الفقهاء، ان قضاء القاضي بالبينة الكاذبة، لا يبيح للمدعي أن يأخذ الحق، ولا غير نوافع، ويبقى الامر المدعي على ملك صاحبه، وقد حكى الامام الشافعي الاجماع على ذالك، لم يخالف فيه احد. وقضاء القاضي ينفذ ظاهراً لا باطناً أي لا يحل ديانة وان ثبت قضاءً. (فقه المعاملات)

## فیصلے سے پہلے مصالحت کی کوشش کرنا:

قاضی کے لئے یہ بات بھی مناسب ہے کہ فیصلہ سے پہلے فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کرے، کیونکہ صلح میں بہتری ہے، کیونکہ قاضی کی ذمہ داری منازعت کا خاتمہ کرنا ہے، یہ صلح ہی کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ اس لئے فیصلہ کسی فریق کے حق میں ہوتا ہے تو دوسرے کی مخالفت میں، اس سے آپس کا نزاع ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔

كقوله تعالى: ﴿فلا جناح عليهما أن يصلحا بينهما صلحا، والصلح خير﴾ (سورة النساء: ١٢٨)

كما فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم: روى البخاري عن كعب بن مالك انه تقاضى من عبد الله بن ابي حدرد الاسلمي دينا له عليه في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم في المسجد فارتفعت حتى سمعهما رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو في بيته فخرج اليهما حتى كشف سجف الى سجف حجرته، فنادى يا كعب، فقال لبيك يا رسول الله قال ضع من دينك هذا، فأومأ اليه اى الشطر، قال لقد فعلت يا رسول الله، قال صلى الله عليه وسلم (لآخر) قم فاقضه.

(اخرجه البخاري: ٢/٦١، ومسلم رقم: ١٥٥٨، في المساقاة)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاۃ مبارکہ میں مسجد نبوی میں انہوں نے عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا دونوں کی آواز کچھ بلند ہوگئی، آپ ﷺ نے گھر میں آواز سنی تو حجرہ مبارک سے پردہ ہٹا کر باہر تشریف لائے (چونکہ پہلے دونوں کی بات سن چکے تھے) اس لئے حضرت مالک سے فرمایا کہ صلح کرلو یعنی اپنا آدھا قرض معاف کردو حضرت مالک نے آپ ﷺ کی سفارش قبول کرلی تو آپ ﷺ دوسرے سے فرمایا کہ تم اب قرض ادا کردو۔

یہ ایک طرح کی سفارش ہے، اس پر بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہے۔

كقوله تعالى: ﴿من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها،

ومن یشفع شفاعۃ سیئۃ یکن لہ کفل منھا (سورۃ النساء: ٨٥)

ترجمہ: جو شخص اچھی سفارش کرے اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا، اور جو شخص بری سفارش کرے اس کو اس کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

## قضاء علی الغیب کا حکم:

حنفیہ کا اصل مسلک یہ ہے کہ اگر مدعا علیہ غائب ہو تو اس کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ فیصلہ کے وقت اس کا خود موجود ہونا یا اس کے وکیل کا موجود ہونا ضروری ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ غائب کے پاس کوئی ایسی دلیل موجود ہو جو مدعی کے دعویٰ کو باطل کر دے۔

قال صاحب الهداية: ولا يقضي القاضي على غائب إلا أن يحضر من يقوم مقامه، كالوكيل أو الوصي لأن العمل بالشهادة لقطع الخصومة والمنازعة ولا منازعة بدون الإنكار ولم يوجد ولأنه يحتمل الإقرار والإنكار من الخصم فيشتبه وجه القضاء.

(الهداية: ١٦٩/٣)

البتہ ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں جب حجت گواہی سے قاضی کے سامنے دعویٰ ثابت ہو گیا تو قاضی کے لئے جائز ہے کہ غائب کے خلاف فیصلہ کرے۔

"واستدلالهم بقصة "هند" امرأة أبي سفيان، أنها جاءت إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم وشكت له أن أبا سفيان رجل شحيح فهل يجوز لي أن آخذ من ماله بغير علمه؟ فقال لها صلى الله عليه وسلم خذي ما يكفيك وولدك بالمعروف".

(طرف من حديث أخرجه البخاري ومسلم)

ہند زوجہ ابی سفیان نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی ابو سفیان بخیل آدمی ہے (یعنی خرچہ پورا نہیں) کیا میرے لیے بلا اجازت شوہر کے مال میں سے لے کر خرچ کرنا جائز ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بقدر ضرورت لے سکتی ہیں جو تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔

"وقالوا هذا قضاء على غائب وقد حكم لها رسول الله صلى الله عليه وسلم وزوجها غائب."

فقد روى مالك في الموطأ أن عمر رضي الله عنه قال الغرماء من كان له دين فليأتنا غدا فإنا بايعوا ماله وقاسموه بين غرمائه.

(انظر الموطأ للإمام مالك رحمه الله)

هذا حكم على الغائب فقد كان الرجل الذي قضي عليه ببيع ماله غائبا. (فقه المعاملات)

خلاصہ یہ ہے کہ مدعیٰ ثابت ہونے کی صورت میں ائمہ ثلاثہ کے ہاں قضاء علی الغائب جائز ہے جبکہ احناف کے ہاں جائز نہیں، البتہ شدید مجبوری کی صورت میں احناف کے ہاں بھی غائب کے خلاف فیصلہ کرنا جائز ہے۔

## مدعیٰ علیہ کی گرفتاری کا حکم:

مدعیٰ علیہ کے ذمہ حق ثابت ہونے کے بعد بھی اگر وہ ادائے حق سے انکار کرے تو قاضی اس کو ادائے حق پر مجبور کرے گا، اگر پھر بھی انکار کرے تو اسکو گرفتار کرکے جیل میں بھیجا جائے گا کیونکہ وہ انکار کی وجہ سے ظالم ہے اور ظلم کا دفع کرنا حاکم کے ذمہ لازم ہے۔

"كقوله عليه السلام: ليُّ الواجد يُحلّ عرضه وعقوبته".

(أخرجه البخاري تعليقا: ٥/٤٦، في الاستقراض، أبو داؤد رقم: ٣٦٢٨)

ومعنى الحديث إن مماطلة القادر على سداد الدين ظلم يبيح التكلم عليه وعقوبته وسجنه.

## سزا کی مدت:

اتنے عرصے تک قید میں رکھا جائے گا کہ اس سے گمان غالب حاصل ہو جائے کہ اگر اس کے پاس مال ہوتا تو ضرور قرض ادا کرکے قید کی مشقت سے جان چھڑا لیتا۔ اگر ایک مدت تک جیل کاٹنے کے باوجود قرض ادا نہ کرے تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا البتہ صاحب حق اس کا تعاقب جاری رکھے گا جب اس کے پاس مال نظر آئے تو اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا۔

ومدة الحبس شهر أو شهران، وتقبل بينة الإعسار بعد الحبس

بالاجتماع مع امكانها قبل الحبس فلا تقبل والظاهر بينهما انه وجد بعد الحبس قرينة، وهي تحمل شدة الحبس ومضايقة، وذلك دليل اعساره. (انظر: الاختيار لتعليل المختار: ۲/۹۰)

## بیمار قیدی کا حکم:

جب قیدی جیل میں بیمار ہو جائے تو جیل کے اندر ہی علاج کروایا جائے گا اگر زیادہ بیمار ہو جائے تو پولیس کی نگرانی میں ہسپتال میں اگر علاج کروایا جائے گا اور صحت یاب ہونے پر دوبارہ جیل بھیج دیا جائیگا، بشرطیکہ مالدار ہونا ثابت ہو جائے یا مدعی ثابت کر دے کہ یہ تنگ دست نہیں۔

## قاضی کے فیصلے کے بغیر اپنا حق وصول کرنے کا حکم:

اگر دوسرے کے ذمہ حق ہے لیکن کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے، اور مقروض انکاری ہے کہ میرے ذمہ تمہارا کوئی حق نہیں ہے، ایسی صورت میں بھی بہتر تو یہی ہے کہ عدالت کے ذریعہ حق وصول کرنے کی کوشش کی جائے لیکن اگر ممکن نہ ہو تو کسی بھی مناسب حیلے کے ذریعہ اپنا حق وصول کرنا جائز ہے، البتہ اس کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار کرے نیز اپنے حق سے زائد وصول نہ کرے۔

## اسلامی عدالت کا ایک انوکھا واقعہ:

اسلام میں قاضی کی عدالت میں امیر وغریب کی کوئی تفریق نہیں اسی طرح حاکم ومحکوم، رشتہ دار وغیر رشتہ دار، باپ بیٹا سب کا ایک ہی حکم ہے کہ مظلوم کی دادرسی کی جائے گی اور ظالم کے ظلم کو دفع کیا جائے گا اگر مدعی علیہ حاکم وقت ہے یا وہ کسی بڑے عہدہ پر فائز ہے ظلم ثابت ہونے یا اس کے خلاف دعوی بینہ سے ثابت ہونے پر قاضی اس کے خلاف بھی فیصلہ سنائے گا، اس سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح کا مشہور واقعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

أخرج الامام أبو نعيم في الحلية هذا الخبر العجيب، قال:

"وجد علي بن أبي طالب رضي الله عنه، درعا له عند يهودي، كان قد التقطها من الطريق، فقال له علي درعي سقطت عن جمل لي أورق، أي أحمر، فقال له اليهودي: درعي وهي في يدي!!.

ثم قال له اليهودي: بيني وبينك قاضي المسلمين.

فأتوا " شريحا " فلما رأى عليا قد أقبل ، وسع له في المجلس ،

فقال شريح : ما تشاء يا أمير المؤمنين !؟

قال : درعي سقطت عن جمل لي أورق ، فالتقطها هذا اليهودي!

فقال شريح : ما تقول يا يهودي ؟قال : درعي وفي يدي !!

فقال شريح : صدقت يا أمير المؤمنين ، انها لدرعك ، ولكن لا بد من البينة ، فأتني بشاهدين يشهدان لك بها !

فدعا علي رضي الله عنه مولاه ، أي مملوكه، قنبر ، ودعا الحسن بن علي ، فشهدا أنها درعه .

فقال شريح : اما شهادة مولاك فقد أجزناها، أي قبلنا ها و أما شهادة ابنك فلا نجيزها! يريد أنها لا تقبل بسبب صلة القرابة . لأن شهادة الولد لوالده ، أو الوالد لولده غير جائزة، لوجود شبهة التحيز .

فقال علي : أصلح الله أمرك ، أما سمعت عمر بن الخطاب يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " الحسن والحسين سيدا شباب اهل الجنة ".

( ترمذي كتاب المناقب رقم: ٣٧٦٨ عن رواية ابي سعيد خدري )

قال شريح : اللهم نعم!!قال علي : أفلا تقبل شهادة سيدا شباب أهل الجنة ؟!فأصر القاضي على عدم قبول شهادته !

فقال علي لليهودي : اذهب فخذ الدرع!!

فقال اليهودي : صاحب أمير المؤمنين جاء معي إلى قاضي المسلمين ، فقضى لي عليه، ورضي بحكمه وقضائه !!

ثم قال اليهودي : صدقت والله يا أمير المؤمنين .

انها لدرعك سقطت عن جمل لك والتقطتها أنا اشهد أن لا اله الا الله وأن محمدا رسول الله ، فوهبها له علي رضي الله عنه ،

وأجازه على اعترافه ووصله بتسع مائة درهم أكراما له، وقتل معه يوم صفين.

(انظر كتاب الحلية لابي نعيم فقد ذكر فيه هذه القصة العجيبة)

ابونعیم نے "حلیۃ الاولیاء" میں نقل فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک زرہ گر گئی تھی جو ایک یہودی نے اٹھالی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب اپنی زرہ یہودی کے پاس دیکھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ زرہ میری ہے اونٹ سے گر گئی تھی تو نے اٹھالی، اور یہودی نے کہا یہ تو میری زرہ ہے میرے قبضہ میں ہے۔ پھر یہودی نے کہا کہ عدالت میں چلتے ہیں، چنانچہ دونوں وقت کے مشہور قاضی شریح کے پاس پہنچے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عدالت میں قاضی کے سامنے اپنا دعویٰ دائر کرایا کہ میری ایک زرہ میرے سرخ اونٹ سے گر گئی تو اس یہودی نے اٹھالی اور واپس نہیں دے رہا ہے تو قاضی یہودی سے پوچھا کہ کیا تو اس نے کہا یہ تو میری زرہ ہے چنانچہ میرے قبضہ میں ہے۔

قاضی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گواہ پیش کرنے کو کہا تو انہوں نے اپنے غلام اور اپنا بیٹا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کیا، قاضی نے کہا غلام کی گواہی تو قبول ہے لیکن بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول نہیں اس لیے کوئی اور گواہ پیش کریں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور تو کچھ ہے، یہ حسن ہیں جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے جنت میں جوانوں کے سردار ہونے کی بشارت دی ہے جب بھی قاضی نے ان کی گواہی قبول نہیں کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ یہودی کے حوالے کردی، جب یہودی نے اس مساوات اور عدل وانصاف کو دیکھا کہ امیر المومنین کے مقابلہ میں ایک یہودی کی بات سنی گئی اور امیر المومنین کے خلاف یہودی کے حق میں فیصلہ ہو گیا تو فوراً انہوں نے کہا امیر المومنین یہ زرہ آپ کی ہے۔ اور کہا "اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده ورسوله" جب وہ مسلمان ہو گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ بھی ان کے حوالے کردی اور مزید انعام بھی دیا پھر وہ پکا مسلمان ہو گیا، یہاں تک کہ جنگ صفین میں آپ رضی اللہ عنہ کی معیت میں لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم)

## عقلمند وہوشیار قاضی:

قاضی کے لئے عقلمند ہوشیار اور معاملہ فہم ہونا ضروری ہے تاکہ عقل وفہم کے ذریعہ اور مدعی

اور مدعا علیہ سے مختلف سوالات کر کے ذریعے حق کو واضح کرے خصوصاً حدود و قصاص وغیرہ معاملات میں دیکھے کہ گواہوں کا بیان مدعی کے موافق ہے یا مدعی کے بیان میں تضاد ہے کیونکہ شبہات کی بناء پر حدود ساقط ہو جاتی ہیں۔

"لقوله عليه السلام: ادرأوا الحدود بالشبهات ما استطعتم فإن كان له مخرج فخلوا سبيله فإن الإمام لأن يخطئ في العفو خير من أن يخطئ في العقوبة." (أخرجه الترمذي: ١٤٢٤)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حدود میں شبہات پیدا ہو جائے تو حتی المقدور حدود کو دفع کرنے کی کوشش کرو، اگر تمہارے سامنے بچنے کا کوئی راستہ نظر آئے تو مجرم کو چھوڑ دو کیونکہ امام کا غلطی سے معاف کر دینا غلطی سے سزا دینے سے بہتر ہے۔ (ترمذی)

**واقعات:**

(۱) گواہوں کو متفرق کر کے ہر ایک سے الگ الگ گواہی حاصل کرنا تاکہ ان کے بیانات کے درمیان اتفاق یا تضاد کو پرکھا جاسکے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک جماعت نے ان کے پاس آکر شہادت دی کہ فلاں شخص نے ایک عورت سے زنا کیا ہے تو انہوں نے ہر گواہ سے الگ الگ گواہی لی تو ایک نے کہا کہ اس عورت نے ایک جوان کے ساتھ زنا کیا سیب کے درخت کے نیچے، دوسرے نے گواہی دی کہ اس نے ایک جوان کے ساتھ زنا کیا امرود کے درخت کے نیچے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے جھوٹ کو پہچان لیا۔

(مصنف [illegible])

(۲) مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ دو عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو لیکر جنگل میں گئیں وہاں بچوں کو ایک جگہ رکھ کر اپنا اپنا کام کاج کرنے میں مصروف تھیں اتنے میں ایک بھیڑیا نمودار ہوا اور ایک بچے کو لیکر غائب ہو گیا اب جو بچہ موجود تھا اس پر دونوں عورتوں کا جھگڑا ہو گیا ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ یہ بچہ میرا ہے اور بھیڑیا تمہارا بچہ لے گیا ہے، دونوں حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو انہوں نے طرفین کی باتیں سن کر بڑی کے حق میں فیصلہ دیا۔

پھر دونوں عورتوں کا حضرت سلیمان علیہ السلام پر گذر ہوا ان کو واقعات اور داؤد علیہ السلام

نے فیصلہ سے گریز کیا تو سلیمان علیہ السلام نے ایک چھری منگوائی اور فرمایا کہ میں بچہ کو درمیان سے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دیتا ہوں۔ یہ بات سن کر بڑی نے رضامندی کا اظہار کیا لیکن چھوٹی عورت جو درحقیقت اس بچے کی ماں تھی اس نے فوراً کہا بچہ اسی کو دے دیں لیکن اس کو ٹکڑے نہ کریں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس عورت کی کامل شفقت و محبت کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ یہ اسی خاتون کا بچہ ہے چنانچہ اس کے حوالے کر دیا۔ یہ ہے قاضی کی ذکاوت اور ہوشیاری، دلائل اور شہادت کے علاوہ فہم و فراست بھی ہو جس سے حق واضح ہو جائے۔

## فیصلہ کرنے کا طریقہ:

جب کوئی شخص دوسرے کے ذمہ حق کا دعویٰ کرے یا کسی مال کی ملکیت کا دعویٰ کرے تو شرعاً اس کو مکلف بنایا جائے گا کہ اپنے دعویٰ کو شہادت و دلائل سے ثابت کرے۔ محض دعویٰ کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ جس نے جو دعویٰ کر لیا وہ سن کر اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے۔

"لقوله عليه السلام: لو يعطى الناس بدعواهم، لادعى رجال أموال قوم ودماءهم، ولكن البينة على المدعي واليمين على من أنكر" (أخرجه البيهقي بإسناد حسن وأخرجه مسلم في صحيحه رقم: ١٧١١، بلفظ ولكن اليمين على المدعى عليه)

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے قاضی مدعی اور مدعا علیہ کا تعین کرے، پھر مدعی علیہ سے سوال کرے کہ اس دعویٰ کے متعلق وہ اقرار کرتا ہے یا انکار؟ اگر اقرار کرے تو فیصلہ کر دے اور اگر انکار کرے تو مدعی سے کہا جائے ثبوت پیش کرے، دستاویز اور گواہوں کو حاضر کرے، اگر ثبوت پیش کر دیا تب بھی اس کے حق میں فیصلہ ہوگا اور اگر ثبوت موجود نہیں ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ مدعی علیہ قسم اٹھائے تو اس کو قسم دی جائے گی۔

## مدعی علیہ کے ذمہ قسم ہے:

مدعی علیہ اگر قسم اٹھا لے تو مقدمہ خارج کر دیا جائے گا، مدعی اب کوئی بات نہیں کر سکتا ہے۔

"لقوله عليه السلام: للمدعي الكندي: ألك بينة؟ قال: لا، قال: فلك يمينه، ليس لك غير ذلك" (أخرجه البخاري: ٢٤١٦، من حديث الأشعث بن قيس قال: في نزلت: ﴿إن الذين يشترون بعهد

الله و ايمانهم ثمناً قليلا ﴾ الآية ، كانت بيني و بين رجل خصومة في بئر فقال النبي صلى الله عليه و سلم : الك بينة ؟ قلت لا، قال : فلك يمينه، ليس لك الا ذلك ، وهذه رواية الصحيحين .

اب اگر مدعی علیہ قسم اٹھانے سے انکار کردے ، صراحت کے ساتھ انکار کرے یا قاضی کی طرف سے مطالبہ کے باوجود خاموشی اختیار کرے، تو بہتر یہ ہے کہ تین مرتبہ قسم دی جائے ، پھر بھی انکار کرے تو مدعا علیہ پر دعویٰ لازم کردیا جائے گا اور اس کے خلاف فیصلہ کردیا جائے گا۔

## مدعی کی قسم پر فیصلہ کرنا جائز نہیں:

اگر مدعی علیہ خود قسم اٹھانے کے بجائے یہ کہے کہ مدعی خود قسم اٹھائے تو میں مان جاؤں گا تو مدعی کو قسم نہیں دی جائے گی ، یعنی مدعی کی قسم پر فیصلہ کیا جائے گا، کیوں رسول اللہ ﷺ نے دعویٰ کے فیصلے کا یہ قانون مقرر فرمادیا ہے کہ گواہ مدعی کے ذمے ہے اور قسم مدعا علیہ کے ذمے۔

" لقوله عليه السلام : البينة على المدعي واليمين على المدعى عليه " . ( انظر الاختيار : ٢/ ١١٤ ، والحديث اخرجه البخاري )

یعنی مدعی کے پاس گواہ نہ ہونے کی صورت میں مدعا علیہ کے ذمہ قسم ہے ، باقی بعض فقہاء کا قول ہے کہ اگر مدعی کے پاس ایک گواہ موجود ہو اور قسم بھی اٹھائے تو یہ قسم دوسرے گواہ کے قائم مقام ہوگی یعنی ایک گواہ اور قسم کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔ ان کا مستدل حدیث ابن عباس ہے۔

" ان النبي صلى الله عليه وسلم قضى باليمين مع الشاهد " .

( مسلم رقم ٢ ١٧١ )

لیکن جمہور فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ایک خاص واقعہ کے متعلق تھی ، اس سے عام قانون کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا جبکہ مذکورہ بالا حدیث بخاری میں موجود ہے۔

## تنبیہ:

یاد رہے کہ مدعا علیہ کی قسم پر دعویٰ کا خارج ہونا ، یہ صرف تجارتی معاملات یا مال کے متعلق دعوؤں میں ہوگا ، باقی حدود و قصاص وغیرہ میں مدعا علیہ کی قسم براءت کے لئے کافی نہیں۔

## ثبوت دعویٰ کا ایک طریقہ مدعی علیہ کا اقرار ہے:

اگر مدعی علیہ یا مجرم خود جرم کا اعتراف کرلے یہ معترف کے حق میں ثبوت جرم کی بڑی دلیل ہے،

اب مزید کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے، اس کے اعتراف پر فیصلہ کیا جائے گا۔

قال تعالیٰ: ﴿ بل الانسان علی نفسه بصیرة ﴾

(سورۃ القیامۃ: ۱۴)

وقال تعالیٰ: ﴿ كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولو على انفسكم ﴾ (سورۃ النساء: ۱۳۵)

ترجمہ: "اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر اگر چہ اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔"

وقوله علیه: واغد یا انیس علی امرأة هذا، فان اعترفت فارجمها. (هذا طرف من حديث اخرجه البخاری: ۲۱/۱۲۶)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ، قصاص، حدود، اور دیگر مالی مقدمات کا فیصلہ اقرار کی بنیاد پر فرماتے تھے۔

البتہ یہ اقرار صرف اقرار کرنے والے کے حق میں ہی معتبر ہوگا دوسرے کے حق میں نہیں، نیز اقرار کے معتبر ہونے کے لئے شرعاً یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر اقرار کی اہلیت موجود ہو، کہ وہ عاقل بالغ ہو اور اس کا ہوش وحواس درست ہو، اس اقرار کے لئے اس پر کوئی جبر نہ ہو۔

## اقرار سے رجوع کرنے کا حکم:

اگر کوئی لوگوں کے حقوق کے متعلق اقرار کرے، مثلاً قرض، وصیت یا وراثت وغیرہ تو اقرار کے بعد ان حقوق کی ادائیگی اس کے ذمہ لازم ہو جائے گی، رجوع کرنا صحیح نہیں۔

اور اگر حقوق اللہ میں سے کسی حق کے متعلق اقرار کرے مثلاً زنا کا اقرار کرے یا شراب نوشی وغیرہ کا تو اس کے اقرار پر حد جاری کیا جائے گا، لیکن اگر وہ حد جاری ہونے سے پہلے یا دوران حد اپنے اقرار سے رجوع کر لیتا ہے تو حد ساقط ہو جائے گا، کیوں کہ رجوع کی وجہ سے اس میں شبہ پیدا ہو گیا اور حدود اللہ شبہ سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

"لقوله علیه السلام: ادرؤا الحدود بالشبهات ما استطعتم فان الامام لأن يخطئ في العفو خير من أن يخطئ في العقوبة".

(اخرجه الترمذي برقم: ۱۴۲۴ في كتاب الحدود)

وفي رواية في الصحيح: "أن النبي صلى الله عليه وسلم قال لماعز حين أقر عنده: لعلك قبلت، أو غمزت، أو نظرت: قال لا، بل زنيت، فعند ذلك أمر برجمه".

(أخرجه البخاري في كتاب الحدود: ١٧٧/٤)

وروي عن عمر بن الخطاب أنه خطب في الناس فقال: والرجم في كتاب الله حق على من زنى إذا أحصن من الرجال والنساء إذا قامت البينة، أو كان الحبل، أو الاعتراف

(صحيح البخاري في كتاب الحدود: ١٨٠/٤)

## مرض الموت میں اقرار کا حکم:

اگر کوئی شخص حالت صحت میں کسی وارث کے حق میں قرض کا اقرار کرے کہ میرے ذمہ فلاں کے اتنا قرض ہے تو اس کا یہ اقرار صحیح ہوگا، اور ادا کرنا لازم ہوگا، لیکن اگر مرض الموت میں کسی وارث کے حق میں اس طرح اقرار کرے، چونکہ اس میں احتمال ہے کہ اس طرح وہ بعض وارث کو زیادہ مال دینا چاہتا ہو دوسرے بعض کو نقصان پہنچا کر اس لئے اس اقرار کا اعتبار نہیں ہوگا الا یہ کہ دوسرے ورثاء اس کی تصدیق کریں۔

كما في الهداية: ولو أقر المريض لوارثه لا يصح، إلا أن يصدقه فيه بقية الورثة، لأنه قد تعلق بماله حق الورثة في مرضه، ولهذا يمنع من التبرع على الوارث أصلا، وإن أقر لأجنبي، جاز لعدم وجود الشبهة. (الهداية في الفقه الحنفي: ٢١٠/٣)

## مرض الموت میں طلاق کے بعد مطلقہ کے حق میں اقرار:

اگر کوئی شخص مرض الموت میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدے، اس کے بعد عدت میں اس عورت کے حق میں قرضہ کا اقرار کرے، پھر قرضہ ادا کئے بغیر وفات پا جائے تو حکم یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس عورت کے حق میراث اور اقرار کردہ مال میں سے کونسا کم ہے، جو کم ہے وہ دیدیا جائے، کیونکہ اس اقرار میں بھی شبہ موجود ہے کہ شاید اس کو زیادہ مال دلانے کے لئے طلاق دیکر اس کے بعد اقرار کا قصد کیا ہے۔

كما في الهداية: إذا طلق زوجته في مرضه ثلاثا، ثم أقر لها بدين ووصى لها بوصية فلها الأقل من الدين ومن ميراثها منه، لأنهما متهمان فيه لقيام العدة، وباب الإقرار مسدود للوارث فلعله أقدم على الطلاق ليصح إقراره لها زيادة على ميراثها. (الهداية: ۳/ ۲۶۱)

## مرض الموت کی تعریف:

مرض الموت ایسی حالت کو کہتے ہیں کہ جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہو اور اسی حالت میں مر بھی جائے، خواہ اسی عارضہ سے مرا ہو یا کسی دوسری وجہ سے، خواہ یہ حالت مرض کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے، مثلاً کوئی شخص کشتی میں ڈوب رہا ہو یا آگ کے اندر گر گیا ہو یا کسی ملبے کے نیچے اس طرح دب ہو کہ بچ نکلنے کی امید نہ ہو یا اگر مرض کا مہلک ہونا معلوم نہ ہو تو اسے مرض الموت جب کہیں گے کہ اس میں اس قدر اضافہ ہو جائے کہ مریض گھر کے باہر کے ضروری مصالح سے عاجز ہو جائے مثلاً عالم مسجد میں جانے سے اور تاجر تجارت سے عاجز ہو جائے اگر مرض کسی مرحلے پر ٹھہر جائے یعنی اس میں اضافہ نہ ہو رہا ہو اور اس ٹھہراؤ کے بعد ایک سال اسی حالت میں گزر جائے تو یہ مرض الموت میں داخل نہیں، پھر جب مرض بڑھ جائے اور اسی زیادتی کی حالت میں مر بھی جائے تو اس زیادتی کے وقت سے مرض الموت شمار ہوگا۔

(البحر الرائق: ۴/۴۳، ورد المحتار: ۲/۲۰۵، مبحث الفتاوی)

# كتاب الشهادة

# شہادت کے احکام کے بیان میں

## شہادت:

اپنے سامنے کسی معاملے کو ہوتا ہوا دیکھ کر یا کان سے سن کر یقین حاصل ہونے کی صورت میں بوقت ضرورت گواہی دینا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اس معاملے کے وقت موجود تھا۔

## شہادت کی ادائیگی کا حکم:

اگر اس معاملے میں اور کوئی گواہ نہ ہو جو گواہ ہے وہ اگر گواہی نہ دے تو حق کے ضائع ہونے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں اگر اس سے گواہی طلب کی جائے تو شہادت دینا فرض ہے۔

لقوله تعالىٰ: ﴿ولا تكتموا الشهادة ومن يكتمها فإنه آثم قلبه﴾

[سورة البقرة: ٢٨٣]

ترجمہ: مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپائے تو بے شک اس کا دل گناہگار ہے۔

﴿وأقيموا الشهادة﴾ (سورة الطلاق: ٢)

"وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا أخبركم بخير الشهداء الذي يأتي بشهادته قبل أن يسألها أو يخبر بشهادته قبل أن يسألها".

[أخرجه مسلم في الأقضية رقم: ١٧١٩، موطا باب خير الشهادة]

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں آپ لوگوں کو نہ بتاؤں کہ گواہی دینے والوں میں بہترین شخص کون ہے؟ پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ جو طلب کرنے سے پہلے ہی گواہی دیدے، یا گواہی کے متعلق مطلع کر دے سوال سے پہلے۔ (مسلم)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کسی معاملہ کے متعلق علم رکھتا ہو، مثلاً ایک شخص کا انتقال ہوا، اس کا کچھ مال دوسرے کے ذمے ہے، وہ انکار کر رہا ہے، ورثاء کے پاس کوئی گواہ موجود نہیں جبکہ بعض لوگوں کو اس حق کا علم ہے، لیکن ورثاء کو ان گواہوں کا علم نہیں، تو ان لوگوں کے لئے لازم ہے کہ خود ہی گواہی دیدے۔

## گواہی کے لئے علم صحیح کا ہونا ضروری ہے:

کسی واقعہ کے متعلق گواہی دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اسی طرح کسی معاملہ کے متعلق گواہی کے لئے ضروری ہے کہ اس معاملہ کے وقت خود موجود ہو اور آنکھوں سے دیکھا اور کان سے سنا ہو، دیکھنے اور معائنہ کئے بغیر گواہی دینا جائز نہیں۔

## وہ مواقع جن میں شہرت کی بنیاد پر شہادت دینا جائز ہے:

شہادت کا عام قانون تو یہی ہے کہ مشاہدہ اور معائنہ کے بغیر شہادت جائز نہیں البتہ بعض مواقع ایسے ہیں کہ ان میں محض شہرت کی بنیاد پر گواہی دینا جائز ہے۔

(1) نسب: مثلاً ایک بچہ کسی کے گھر میں پیدا ہوا، اس کا ذکر کئی ہی ہے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اس شہرت کی بناء پر اس کے بیٹا ہونے کی گواہی دی جاسکتی ہے۔

(۲) موت: ایک شخص کا انتقال ہوا اعلان ہو گیا کہ مرنے والا فلاں بن فلاں ہے، یہ خبر لوگوں میں مشہور ہو گئی، اب جن لوگوں نے اس کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا ان کے لئے بھی جائز ہے کہ شہادت دیں کہ فلاں بن فلاں کا انتقال ہو گیا ہے۔

(۳) نکاح: دو مرد و عورت ایک جگہ رہائش پذیر ہیں، دونوں میاں بیوی ہونے کے مدعی ہیں، اب اس شہرت کی بناء پر گواہی دینا جائز ہے۔

(۴) ولایۃ القاضی: ایک شخص قاضی ہونے کا دعویدار ہے کہ اس کو حاکم وقت کی طرف سے عہدۂ قضاء پر فائز کیا گیا ہے، مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں، عدالت میں بیٹھ کر مقدمات کا فیصلہ کر رہا ہے، لوگوں نے سنا کہ یہ قاضی صاحب ہیں، بعد میں اس بنیاد پر اس کے قاضی ہونے کی گواہی دینا جائز ہے۔

(۵) اصل الوقف: ایک جائیداد مثلاً مکان، مدرسہ وغیرہ کے متعلق مشہور ہے کہ یہ موقوفہ جائیداد ہے، ایک زمانے کے بعد اس پر شہادت کی ضرورت پیش آئے تو اس کے موقوف ہونے کی شہادت دینا جائز ہے اگرچہ وقف کرتے وقت گواہی دینے والا موجود نہ تھا۔

قال في الاختيار: ويجوز أن يشهد بكل ما سمعه أو أبصره من الحقوق والعقود لأنه علمه وتيقنه ويقول أشهد بكذا، ولا يقول أشهدني لأنه كذب، وتجوز شهادة المختبي، وهو أن يقر الرجل بحق، والشهود مختفون في بيت يسمعون إقراره فإنه يحل لهم الشهادة إذا كانوا يعرفون وجهه ويرونه.

ولا يجوز لأحد أن يشهد بما لم يشاهده ويعاينه إلا النسب والموت، والنكاح، وولاية القاضي، وأصل الوقف لأن هذه الأشياء تكون بحضور جماعة مخصوصة، فقامت الشهرة والاستفاضة مقام العيان والمشاهدة، ألا ترى أنا نشهد أن عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم وأن فاطمة ابنته، ونشهد بخلافة أبي بكر وعمر والخلفاء الراشدين بالاستفاضة، والشهرة إنما تكون بالتواتر أو بإخبار من يثق الشاهد به، كما إذا أخبرنا أحد أن فلانا مات، فتجوز الشهادة بموته،

فاسق کی گواہی معتبر نہیں ہے۔

وقال عمر رضي الله عنه : لا تقبل شهادة خصم ولا ظنين

(اخرجه مالك في الموطا عن عمر موقوفا ، ٢/٧٢٠)

## قریبی رشتہ داروں کی شہادت معتبر نہیں:

اصول وفروع یعنی ماں و باپ، دادا، دادی، نانی وغیرہ کی شہادت اپنی اولاد کے حق میں، یا اولاد کی شہادت اپنے اصول ماں، باپ وغیرہ کے حق میں معتبر نہیں، نیز میاں، بیوی کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں معتبر نہیں، نیز نوکر، نوکرانی جو گھر میں رہتے ہیں ان کی شہادت اپنے مالک کے حق میں معتبر نہیں۔

فلا تقبل شهادة الوالد لولده، ولا الام لابنها، ولا الولد لامه، ولا الزوج لزوجته، ومثله الخادم الذي ينفق عليه صاحب البيت، فان الشهادة في هذه الحال لا تقبل لوجود التهمة .

وفي الحديث : ولا تجوز شهادة خائن ولا خائنة ولا ذي غمر على أخيه ولا تجوز شهادة القانع لاهل البيت

(ابو داؤد كتاب القضاء رقم : ٣٦٠٠ ، وابن ماجه في الاحكام رقم : ٢٣٦٦)

القانع : الخادم الذي ينفق عليه أهل البيت (فقه المعاملات)

## وہ رشتے جن کی شہادت معتبر ہے:

اصول وفروع اور زوجین کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کی شہادت قابل قبول ہے، مثلاً بھائی کی شہادت بھائی کے حق میں، یا چچا، پھوپھی، چچازاد بھائی، یا بھتیجے وغیرہ کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں شرعاً معتبر ہے۔

وبهذا اخذ الجمهور . (فقه المعاملات)

## نصاب شہادت:

عام معاملات، بیع شراء، قرض، اجارہ، رہن، اقرار، غصب وغیرہ میں مردوں کی طرح عورتوں کی گواہی بھی معتبر ہے، یعنی ایک مرد ہو اس کے ساتھ دو عورتیں ہوں اس طرح عورتوں کی گواہی شرعاً معتبر ہے، صرف تنہا عورتوں کی گواہی معتبر نہیں، مثلاً چار عورتیں مل کر شہادت دیں کہ ہم گواہی

دعویٰ پیش کرتا ہے کہ زید نے اس کو یہ زمین فروخت کی ہے، لیکن مرد گواہ موجود نہیں تو صرف عورتوں کی گواہی سے عمرو کے حق میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا، اگر قاضی فیصلہ کردے تو شرعاً وہ فیصلہ معتبر نہیں ہوگا۔

اسی طرح نکاح، طلاق، عدت، رجعت وغیرہ میں بھی عورتوں کی گواہی مردوں کی معیت میں معتبر ہے۔

## حدود و قصاص میں خواتین کی شہادت غیر معتبر ہے:

البتہ حدود و قصاص میں خواتین کی شہادت شرعاً معتبر نہیں چاہے تنہا شہادت دے یا مردوں کے ساتھ مل کر شہادت دے، بلکہ حدود و قصاص کے ثبوت کے لئے دو مردوں کی شہادت ضروری ہے، مثلاً زید کا دعویٰ ہے کہ میرے بھائی نعیم کو خالد نے قتل کیا ہے اور اس مقدمہ کا گواہ صرف سلیم ہے، اور پانچ خواتین ہیں، تو چونکہ مقدمہ قتل کے ثبوت کے لئے دو مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے، جبکہ یہاں صرف ایک ہے اگرچہ اس کے ساتھ پانچ خواتین گواہ بھی موجود ہیں، لیکن نصاب شہادت نامکمل ہونے کی بناء پر زید کا مقدمہ خارج کردیا جائے گا۔

﴿واستشهدوا شهيدين من رجالكم فإن لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء أن تضل إحداهما فتذكر إحداهما الأخرى﴾ (سورة البقرة: ٢٨٢)

ترجمہ: اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنا لو، اگر دو مرد گواہ میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے۔ (بیان القرآن)

وذهب الجمهور إلى أن شهادة النساء مع الرجال جائزة في الأموال، والنكاح، والرجعة، والطلاق وكل شيء إلا في الحدود والقصاص، فلا تقبل فيها شهادة النساء لعلة العاطفة عندهن، ولأن الحدود تدرء بالشبهات.

قال الزهري: مضت السنة من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعده، أن لا شهادة للنساء في الحدود

اعتماد کرتے ہوئے اپنے کو معزول سمجھے۔

(۶) کسی مبیع کے متعلق بتائے کہ اس میں یہ عیب ہے تو اس پر اعتماد کرتے ہوئے وہ مبیع کا واپس یا استعمال کرے وغیرہ وغیرہ۔

## جن مواقع میں تنہا عورت کی شہادت معتبر ہے:

عورتوں کے جن حالات پر شرعاً مرد مطلع نہیں ہو سکتا ان میں تنہا ایک عورت کی شہادت بھی معتبر ہے، مثلاً ولادت، یا پردۂ بکارت کا قائم ہونا یا زائل ہونا، یا عورتوں کے بعض عیوب، نیز اگر صرف دائی اطلاع دے کہ پیدائش کے وقت بچے کے رونے کی آواز نکلی تھی پھر انتقال کر گیا تو صرف اس کی شہادت پر حیاۃ ثابت ہوگی، اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔

وفي الحديث أن النبي صلى الله عليه وسلم: "أجاز شهادة القابلة" دارقطني في سننه عن حذيفة بن اليمان.

(مجمع الزوائد: ٤/ ٢٠١)

وروى عبد الرزاق في مصنفه عن الزهري أنه قال: مضت السنة أن تجوز شهادة النساء فيما لا يطلع عليه غيرهن، من ولادات النساء وعيوبهن. (نصب الراية: ٤/ ٨٠)

## وہ افراد جن کی شہادت مردود ہے:

چونکہ شہادت کے لئے گواہ کا عادل و دیندار ہونا شرط ہے اس لئے ہر وہ شخص جو اعلانیہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو اس کی شہادت مردود ہے، مثلاً اداکار، گلوکار، ہیجڑے، شراب خور، جوئے باز، سود خور وغیرہ، کیوں کہ جب اعلانیہ طور پر گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو شہادت کے معاملہ میں بھی ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

قال في كتاب الاختيار: ولا تقبل شهادة مخنث ولا نائحة ولا مغنية ولا من يغني للناس لأن ذلك فسق لأنه عليه السلام: "نهى عن صوتين أحمقين: النائحة والمغنية". (ترمذي: ١٠٠٥)

ولا تقبل شهادة المدمن على الشرب واللهو، ولا من يعمل كبيرة

فوجب الحد، ولا من يأكل الربا، ولا من يلعب بالشطرنج، ولا من يدخل الحمام بغير إزار. (تنوير الأبصار: ۲/۱۰۰، الهداية ۳/۱۳۰)

## جھوٹی گواہی عظیم گناہ ہے:

سچی شہادت اجر عظیم کا باعث ہے، لیکن جھوٹی شہادت بڑا ہی قبیح گناہ ہے، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

كقوله تعالى: ﴿فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور﴾ (سورة الحج: ۳۰)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ اکبر الکبائر ہے شرک اور والدین کی نافرمانی کے بعد سب سے بڑا گناہ جھوٹی گواہی کو قرار دیا۔

"كما روى البخاري ومسلم: ألا أنبئكم بأكبر الكبائر؟ قلنا بلى يا رسول الله! قال الإشراك بالله وعقوق الوالدين، وكان صلى الله عليه وسلم متكئا فجلس، فقال ألا وشهادة الزور، أو قال قول الزور، فما زال يكررها حتى قلنا ليته سكت، خشية عليه من شدة التأثر والغضب" (أخرجه البخاري رقم: ۲٦٥٤، ومسلم رقم ۸۷)

جناب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا میں تمہیں اکبر الکبائر سے مطلع نہ کردوں؟ ہم نے کہا ضرور، یا رسول اللہ (ﷺ) پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، یہ ارشاد فرماتے وقت آپ ﷺ ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے تو سیدھے ہو کر بیٹھے اس کے بعد ارشاد فرمایا، جھوٹی گواہی، یا جھوٹی بات، پھر آپ مسلسل یہ جملہ دہراتے رہے، آپ ﷺ کے اس قول کے بار بار تکرار سے متأثر ہونے اور غصہ کی کیفیت کو دیکھ کر ہم (دل ہی دل میں) تمنا کرنے لگے، اے کاش کہ آپ ﷺ خاموش ہو جاتے۔ (بخاری ومسلم)

## دستاویز کا حکم:

کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے دستاویز بھی ایک اہم ثبوت ہے۔

كقوله تعالى: ﴿ولا تسأموا أن تكتبوه صغيرا أو كبيرا إلى أجله

ذلکم اقسط عند اللہ و اقوم للشہادۃ و ادنیٰ ألا ترتابوا ﴾

(سورۃ البقرۃ: ۲۸۲)

اور یہ کہ تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو، (اس لئے لکھ لینا ہی زیادہ اچھا ہے)۔

لہٰذا جب کوئی معاملہ کیا جائے تو اس کو لکھ لیا جائے اور دستاویز کو پختہ کرنے کے جو قانونی تقاضے ہیں ان کو پورے کئے جائیں اور دستاویز صحیح ہو عدالت میں ثابت ہو جائے تو قاضی کو اس کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا، مدعی علیہ کا دستاویز کو حق تسلیم کرنا اقرار حق کے قائم مقام ہے۔

## مدعی علیہ کا قسم میں توریہ کا حکم:

جب مدعی علیہ کے ذمہ قسم لازم آئے اور وہ قسم اٹھائے تو اس میں مدعی یا قاضی جو قسم دلانے والا ہے اس کی نیت کا اعتبار ہوگا قسم اٹھانے والے کی نیت کا اعتبار نہ ہوگا، کیوں کہ کبھی قسم اٹھانے والا کسی اور چیز کی نیت کرتا ہے۔

مثلاً زید کا دعویٰ ہے کہ بکر نے مجھ سے مکان خریدا ہے اس کی قیمت دو لاکھ روپیہ اس کے ذمہ واجب ہے وہ دے نہیں رہا ہے، اور بکر اس کا انکار کرتا ہے زید کے پاس کوئی گواہ نہیں اس لئے بکر کو قسم دی گئی کہ قسم اٹھائے کہ اس کے ذمہ زید کا دین بسلسلہ خریداری مکان نہیں ہے، اب بکر قسم اٹھاتا ہے لیکن قسم کے وقت نیت کرتا ہے کہ میں نے زید سے کوئی قرض نہیں لیا تو اس نیت کا کوئی اعتبار نہیں۔

"لقولہ علیہ السلام: یمینک علی ما یصدقک علیہ صاحبک"

(اخرجہ مسلم باب یمین الحالف علی نیۃ المستحلف رقم: ۱۶۵۳)

امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ضمن میں فرمایا ہے کہ قسم میں قاضی یا قسم دلانے والے کی نیت کا اعتبار ہوگا، یہاں قسم اٹھانے کا توریہ عند اللہ کوئی فائدہ نہ دے گا، اگر جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ حدیث کی رو سے بڑا گناہگار اور مجرم ہوگا۔

اور جھوٹ بول کر دوسرے کے مال کو ہڑپ کرنا گناہ عظیم ہے، حدیث میں صراحت کے ساتھ

مذکور ہے۔

"لقوله عليه السلام: من حلف على يمين يقتطع بها مال امرئ مسلم لقي الله وهو عليه غضبان" (اخرجه مسلم رقم: ٢٢٣)

کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلم بھائی کا مال کھائے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہوگا۔ (مسلم)

## توریہ کی جائز صورت:

ہاں البتہ بعض فقہاء نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص مجبور ہو تو زید حق اس پر مال کا دعویٰ ہے اب اس کے لئے اپنا مال بچانے کی کوئی صورت نہیں تو دفع ظلم کے لئے وہ توریہ کر کے جھوٹی قسم اٹھاتا ہے اور اپنا مال بچاتا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی۔ (فقہ المعاملات)

# احکام الصلح فی المعاملات

## معاملات میں صلح کے احکام

### صلح کے لغوی معنی:

نزاع کو ختم کرنا۔

كما في قوله تعالى: ﴿وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما﴾ (سورة الحجرات: ٩)

### شرعی معنی:

کوئی ایسا درمیانہ راستہ تلاش کرنا جو دونوں فریق کے لئے قابل قبول ہو جس سے آپس کی منازعت ختم ہو جائے اور بغض و عداوت کی چیز ختم ہو جائے۔

### صلح کی اقسام:

(۱) دو ملکوں کا سرحدی پر صلح کرنا۔

(۲) مسلمان اور کفار کا آپس میں کسی معاملہ پر صلح کرنا۔

(۳) جنگی معاہدات۔

(۴) دو قوموں کا آپس میں مصالحت کرنا۔

(۵) میاں بیوی کے آپس کی مصالحت۔

(۶) کسی وارث کا کچھ مال لیکر دوسرے ورثاء سے صلح کر لینا۔

(۷) مدعی اور مدعی علیہ کا آپس میں صلح کرنا۔

ان صورتوں میں صرف آخری قسم کے متعلق تفصیلات اور فقہی احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

## صلح کی مشروعیت:

جب کوئی شخص دوسرے پر مال کا دعویٰ کرے اور دوسرا انکار کرے تو فیصلہ کا ایک راستہ تو قضاء کا ہے دوسرا راستہ مصالحت کا، قضاء کی صورت میں وقتی طور پر مقدمہ تو نمٹ جاتا ہے لیکن عام طور پر آپس کا نزاع ختم نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی وقت پھر لڑائی شروع ہونے کا امکان ہوتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ فیصلہ غلط ہو جاتا ہے اور ناحق مال دوسرے کو مل جاتا ہے۔

دوسرا راستہ جو صلح کا ہے، اس میں عموماً آپس کی بغض و عداوت ختم ہو جاتی ہے اور معاشرے کے اندر امن کی فضاء قائم ہو جاتی ہے اس لئے شریعت نے قضاء کے بجائے صلح کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔

کقولہ تعالیٰ: ﴿وان امرأة خافت من بعلها نشوزا او اعراضا فلا جناح عليهما ان يصلحا بينهما صلحا والصلح خير﴾

(سورۃ النساء: ۱۲۸)

ترجمہ: اگر کوئی عورت ڈرے اپنے خاوند کے لڑنے سے یا جی پھر جانے سے تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ آپس میں کسی طرح صلح کر لیں اور صلح خوب چیز ہے۔ (تفسیر عثمانی)

"وقال عليه السلام: الصلح جائز بين المسلمين، الا صلحا حرم حلالا او احل حراما والمسلمون على شروطهم."

(اخرجه الترمذي: ۱۳۵۲، ابو داؤد: ۳۵۹۴ في الاقضية)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کا آپس میں صلح کرنا جائز ہے ہاں ایسی صلح کرنا جس سے کسی حرام کو حلال کیا جائے یا حلال کو حرام کیا جائے (وہ ناجائز ہے) اور مسلمان اپنے وعدہ و عہد کے پابند ہوتا ہے۔ (یعنی اس کے خلاف نہیں کرتا) (ابو داؤد، ترمذی)

شیخ ساجولی فرماتے ہیں وہ صلح جو حلال کو حرام کرے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر پر شرط رکھتی ہے کہ شوہر اس کی دوسری سوکن سے ہم بستری نہ کرے اور حرام کو حلال کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ جوا کھیلنے پر صلح کرنا یا قرض کے بدلے مثلاً ایک من شراب دینے کی شرط ٹھہرانا وغیرہ، نیز ہر وہ چیز جس کا استعمال شرعاً حرام ہے اسکو بیع وشراء، لین دین میں عوض ٹھہرانا۔ (فقہ المعاملات)

## صلح کی صورتیں:

(۱) صلح عن اقرار۔ مدعا علیہ حق کا اقرار کرتا ہے کہ ہاں میرے ذمہ میں تمہارے دس ہزار روپے لازم ہیں لیکن میں پورا قرض دینے پر تیار نہیں ہوں تم اپنے حق کا کچھ حصہ معاف کر دو تو میں دینے کے لئے تیار ہوں اب مدعی اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

(۲) صلح عن انکار۔ یعنی مدعا علیہ اپنے ذمہ حق کے لازم ہونے کا منکر ہے اب اس کے ذمہ قسم لازم ہے تو وہ قسم اٹھانے کے بجائے مدعی سے اس کے مطلوبہ مقدار سے کچھ کم پر صلح کرتا ہے جمہور فقہاء کے نزدیک صلح کا یہ طریقہ جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں مدعی علیہ قسم اٹھانے، اپنے نفس کو ذلیل کرنے اور عدالتوں کے چکر کاٹنے کے بجائے مال خرچ کر کے اپنے آپ کو مشقت اور ذلت سے بچاتا ہے یہ اس کے حق میں جائز ہے، باقی مدعی اگر باطل پر ہو یعنی غلط دعوے سے دوسرے کا ناحق مال بٹورنا چاہتا ہے تو اس کے حق میں صلح کے ذریعہ حاصل ہونے والا مال حرام ہی رہے گا، صلح کی وجہ سے دوسرے کا مال حلال نہیں ہو سکتا۔

قال ابو حنيفة رحمه الله اجود مايكون الصلح عن انكار، لان الحاجة في جوازه امس، لان الصلح لقطع المنازعات، و[illegible] ظاهرات، وهو في الصلح مع الانكار ابلغ وللحاجة والضرورة اثر في تجويز المعاقدات، ولو ابطلناه لفتح باب المنازعات.

(انظر الاختيار لتعليل المختار: ۳ / ۵)

## صلح کے ارکان:

صلح بھی دوسرے عقود کی طرح ایک عقد ہے لہذا صلح کے انعقاد کے لئے ایجاب وقبول کا ہونا ضروری ہے، ایجاب وقبول کے لئے کوئی متعین عبارت ادا کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر وہ

عبارت ہو تو صلح پر طرفین کی رضامندی پر دلالت کرے تو اس سے صلح منعقد ہو جائے گی۔

مثلاً قال: صالحتك على ألف درهم عن الألف التي لك عندي

وقال الآخر قبلت.

یعنی ایک کہتا ہے کہ میرے ذمے تمہارے جو دو ہزار قرض ہے میں ایک ہزار کے عوض تم سے صلح کرتا ہوں یا ایک ہی ہزار دیتا ہوں؟ دوسرا جواب میں کہتا ہے ہاں مجھے قبول ہے یا منظور ہے تو اس سے صلح منعقد ہو جائے گی۔

## صلح کی شرائط:

1- عاقدین عاقل بالغ ہوں لہٰذا بچہ اور مجنون کی صلح جائز نہیں۔

2- مصالح علیہ مال متقوم ہو، یا ایسا حق ہو جس کا عوض لینا شرعاً جائز ہو جیسے قصاص وغیرہ، کیوں کہ قصاص کے بدلے میں مال دے کر صلح کر لینا جائز ہے۔

لقوله تعالى: ﴿فمن عفي له من أخيه شيء فاتباع بالمعروف وأداء إليه بإحسان﴾ (سورة البقرة: ١٧٨)

ترجمہ: پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی تو (دیت کا) معقول طور پر مطالبہ کرنا چاہیے اور (قاتل کو) خوبی کے ساتھ مال (مقتول کے ورثاء تک) پہنچانا چاہیے۔

## وہ حقوق جن میں صلح جائز نہیں:

بعض حقوق چونکہ شرعاً ان کا عوض لینا جائز نہیں لہٰذا ان پر صلح کرنا بھی جائز نہیں۔

جیسے حق شفعہ ہے، کسی کو زمین پر حق شفعہ کے دعوی کا حق حاصل ہے اب وہ صلح کرتا ہے کہ اتنی رقم دے دو میں حق شفعہ کا دعوی چھوڑ دیتا ہوں اب اسی پر صلح کر لیتا ہے شرعاً جائز نہیں، اس صلح کا عوض بھی حلال نہیں۔

اسی طرح حد قذف اور کفالہ بالنفس وغیرہ۔

## حدود اللہ میں صلح جائز نہیں:

حقوق العباد میں تو صلح کرنا جائز ہے لیکن حدود اللہ میں صلح جائز نہیں لہٰذا اگر سزا میں کسی چور کا ہاتھ کاٹا جا رہا ہو وہ صلح کرے کہ اتنا مال دیتا ہوں میرا ہاتھ نہ کاٹا جائے تو یہ صلح شرعاً حرام ہے اسی

طرح کوئی شرابی پکڑا گیا اور عدالت میں پیش ہوا، اس پر حد شرب جاری کرنے کا فیصلہ ہوا اب وہ مال پر صلح کرنا چاہتا ہے تا کہ اس پر حد جاری نہ ہو یہ بھی شرعاً جائز نہیں۔ اگر قاضی ایسا کرے تو بڑا خائن ہوگا، جو کچھ مال سے گا وہ رشوت ہوگی اس کا استعمال بھی حرام ہوگا۔

كما ورد في الحديث: "انه عليه السلام غضب على اسامة بن زيد، لما اراد أن يشفع في المرأة المخزومية، التي سرقت على عهد النبي صلى الله عليه وسلم وقال له: اتشفع في حد من حدود الله يا اسامة! انما اهلك الذين من قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه واذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد والذي نفس محمد بيده لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها."

(هذا طرف من حديث اخرجه البخاري في الحدود: ١٢/٧٦، مسلم: ١٦٨٨)

یعنی بنی مخزوم کی ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں چوری کی، جرم ثابت ہونے پر سزا میں اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ ہوا، اعزہ و اقارب کو خیال ہوا رسول اللہ ﷺ سے سفارش کی جائے تاکہ سزا معاف فرما دیں، اس کام کے لئے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو واسطہ بنایا جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں سفارش کا اقدام کیا تو رسول اللہ ﷺ حضرت اسامہ پر ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا اسامہ! کیا تم حدود اللہ کو ساقط کرنے کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ تم سے پہلے قومیں اسی طرح ہلاک ہو گئیں کہ ان میں کوئی مالدار چوری کرتا تو اس پر حد جاری نہیں کرتے اور اگر کوئی کم درجہ کا آدمی چوری کرتا تو سزا میں ہاتھ کاٹ دیا جاتا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) بھی چوری کرتی تو میں سزا میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ (بخاری)

قال في كتاب الاختيار: ولا يجوز الصلح عن الحدود لانها حق الله تعالى، ولا عن حد القذف لانه وان كان فيه حق العبد لكن المغلب في حد القذف حق الشرع عندنا.

(الاختيار لتعليل المختار للموصلي: ٣/٧)

## دو شریکوں میں سے ایک کے صلح کرنے کا حکم:

دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہیں اس مشترکہ کاروبار میں کسی کو ادھار یا قرض دے دیا کسی اور جہت سے دونوں کا مشترکہ قرضہ تیسرے شخص کے ذمہ میں واجب ہے اب ایک شریک اپنے حصہ قرض کے بارے میں مدیون سے صلح کر لیتا ہے اور صلح کا عوض وصول کر لیتا ہے تو دوسرے شریک کو دو باتوں کا اختیار ہوگا۔

(1) چاہے تو صلح سے حاصل ہونے والے مال کا آدھا حصہ اپنے شریک سے وصول کرے پھر دونوں مل کر بقیہ ادھار قرضہ وصول کرنے کی کوشش کریں۔

(2) چاہے تو جب ایک شریک نے اپنا حصہ صلح کے ذریعہ وصول کر لیا تو دوسرا شریک بھی مقروض سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔

قال صاحب الهداية: وأصل هذه المسألة أن الدين المشترك بين اثنين إذا قبض أحدهما شيئا منه فلصاحبه أن يشاركه في المقبوض، لأنه ازداد بالقبض مالية، وهذه الزيادة راجعة إلى أصل الحق فله المشاركة ولكنه قبل المشاركة باق على ملك القابض، وقد قبضه بدلا عن حقه فيملكه حتى ينفذ تصرفه فيه ويضمن شريكه حصته (الهداية ٣/٢٢٤).

## صلح کے متفرق مسائل:

1. ایک شخص نے کسی عورت پر دعویٰ کیا کہ یہ میری بیوی ہے عورت نے انکار کر دیا لیکن مرد کے اصرار کو دیکھ کر عورت نے کچھ مال پر صلح کر لی تو یہ جائز ہے گویا کہ یہ مرد کے حق میں خلع شمار ہوگا کہ عورت نے مال دے کر خلع کر لی اور عورت کے حق میں صلح کہ اس نے مقدمہ ختم کرنے کے لئے مال خرچ کیا البتہ حقیقت میں دونوں میں کوئی نکاح نہیں ہوا تھا مرد نے جھوٹا دعویٰ کیا تو ایسی صورت میں صلح کے عوض کا استعمال مرد کے لئے حرام ہوگا عورت کو واپس کرنا ضروری ہے۔

2. اگر ایک عورت نے کسی مرد پر نکاح کا دعویٰ کیا کہ یہ میرا شوہر ہے مرد نے انکار کیا اس کے بعد کچھ مال دے کر اس عورت سے صلح کر لی تا کہ عورت دعویٰ چھوڑ دے یہ جائز نہیں کیوں کہ

اگر حقیقت میں یہ اس کی بیوی ہے تو مرد بیوی کو نکاح سے فارغ کرنے کے لئے مال نہیں دیتا بلکہ عورت مال دے کر خلع کرتی ہے، اور اگر دونوں میں نکاح نہیں ہوا تھا تب بھی مال دینا جائز نہیں جو مال دیا گیا وہ رشوت کہلائے گا۔

## میراث میں مصالحت جائز ہے:

حصۂ میراث میں صلح جس کو اہل میراث کی اصطلاح میں ''تخارج'' کہا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک وارث کا میراث میں جتنا حصہ بنتا ہے اس کے بدلہ میں کوئی متعین مال لیکر صلح کرلیتا ہے، کہ فلاں متعین مال (مثلاً دوکان، مکان، جائیداد) مجھے دے دیا جائے اور میراث میں جو میرا حصہ بنتا ہے وہ آپ بقیہ ورثاء آپس میں تقسیم کرلیں یا اتنی رقم دیدیں بقیہ آپ تقسیم کرلیں صلح کی یہ صورت شرعاً جائز ہے۔

فقد روی عن عثمان بن عفان رضی اللّٰہ عنه أنه صالح تماضر الاشجعية امرأة عبد الرحمن بن عوف رضی اللّٰہ عنه علی ثمانين الف دينار (۸۰) عن ربع ثمنها تركة زوجها لانها كانت احدى اربع زوجات بحضرة الصحابة، فلم ينكر عليه احد، فكان اجماعاً۔

(رواه سعيد بن منصور بسند صحيح، اعلاء السنن: ۳۷/۶۱)

## تعجیل کے مقابلہ میں دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

زید عمر کے ذمہ ایک لاکھ روپے واجب الاداء ہے جو چھ ماہ بعد اداء کرنا لازم ہے، اب زید کہتا ہے کہ تم فوری اداء کرو میں بیس ہزار معاف کرتا ہوں (۲۰۰۰۰)، یہ صلح شرعاً جائز نہیں ہے، گویا یہ بیس ہزار اس مدت کے عوض دیا اور لیا گیا ہے، جبکہ مدت کا کوئی عوض لینا اور دینا ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا یہ بھی حرام ہوا۔

(انظر كتاب الاختيار: ۹/۳، الهداية: ۲۲۰/۳)

اس مسئلہ کی تفصیل میں شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم تحریر فرماتے ہیں۔

آج کل بعض تجار ''دین مؤجل'' (وہ دین جس کی ادائیگی کی تاریخ ابھی نہیں آئی) میں یہ معاملہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے دین کے کچھ حصے کو اس شرط پر چھوڑ دیتے ہیں کہ مدیون باقی دین فی الحال اداء کردے، مثلاً عمر پر زید کے ایک ہزار روپیہ دین تھا، اب زید عمرو سے کہتا ہے کہ میں سو

نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"اسلفت رجلا مائة دينار ثم خرج سهمي في بعث بعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقلت له: عجل لي تسعين دينارا واحط عشرة دنانير، فقال: نعم، فذكرت ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: اكلت ربا يا مقداد واطعمته"

میں نے ایک شخص کو ایک سو دینار بطور قرض دیے، اس کے بعد حضور ﷺ جو لشکر بھیج رہے تھے اس میں میرا نام بھی آگیا، میں نے اس شخص سے کہا کہ اگر تم مجھے نوے دینار فوراً دے دو، میں تمہیں دس دینار چھوڑ دیتا ہوں، اس نے منظور کرلیا (اور میں نے اس سے نوے دینار لے لئے) پھر بعد میں کسی وقت حضور ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے مقداد! تم نے خود بھی سود کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا۔ (حوالہ بالا)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کردی ہے کہ سند کے اعتبار سے دونوں حدیثیں ضعیف ہیں، اس لئے دونوں میں سے کسی ایک کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا، البتہ فقہاء نے جانب حرمت کو ترجیح دی ہے، اس لئے کہ جب دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی کرنا سود میں داخل ہے، اسی طرح دین کی تعجیل اور جلدی کی صورت میں دین کے اندر کمی بھی اسی میں داخل ہے۔

جہاں تک بنی نضیر کے واقعے کا تعلق ہے، تو وہ حجت نہیں بن سکتا، اولاً تو اس لئے کہ اس کی سند ضعیف ہے، ثانیاً اس لئے کہ اگر سنداً اس واقعہ کو درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو یہ بات ممکن ہے کہ بنی نضیر کی جلاوطنی کا یہ واقعہ ۲ھ میں پیش آیا ہو، اس طرح یہ واقعہ سود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے کا ہو جائے گا۔

علامہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ ذکر کرکے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"ولما اجلى بني النضير قالوا: ان لنا ديونا على الناس، فقال: ضعوا وتعجلوا، ومعلوم ان مثل هذه المعاملة لا يجوز بين المسلمين فان من كان له على غيره دين الى اجل، فوضع عنه بعضه

بشرط أن يعجل بعضه، لم يجز، كره ذلك عمر وزيد بن ثابت وابن عمر رضي الله عنهم."

(شرح السير الكبير للسرخسي: ٤/١٤٦١، فقرہ نمبر ٢٧٢٨، پھر دوبارہ یہی مسئلہ صلاح الدین المنجد کی تحقیق کے ساتھ: ج ۴/ ۱۹۳۳ فقرہ نمبر ۳۹۳۱ پر ذکر کیا گیا ہے)

جب حضور ﷺ نے بنو نضیر کو جلا وطن کر دیا تو وہ لوگ حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین ہیں، تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: دین کا کچھ حصہ ساقط کر دو اور بقیہ دین فوراً لے لو، اور یہ بات طے ہے کہ مسلمان کے درمیان آپس میں یہ معاملہ ناجائز ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہو اور دین کی ادائیگی کا وقت ابھی نہ آیا ہو تو وہ دائن اگر اس شرط پر دین کا کچھ حصہ چھوڑ دے کہ مدیون دین فوراً ادا کر دے تو یہ معاملہ جائز نہیں، اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے اس معاملے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مسلمان بنی نضیر کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور اس وقت ان کے لئے بنی نضیر کے پورے مال پر قبضہ کر لینا بھی جائز تھا، لہٰذا اگر مسلمانوں نے ان کے دین کا بعض حصہ کم کر دیا تو یہ بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

بنی نضیر کے قصے سے استدلال درست نہ ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہود دوسرے لوگوں سے سود پر دین کا معاملہ کرتے تھے اور حضور ﷺ نے دین کے جس حصے کو ساقط کرنے کا حکم فرمایا ہے، اس سے مراد وہ سود ہے جو راس المال سے زائد ہو، راس المال میں کمی کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اس بات کی تائید واقدی کی عبارت سے ہوتی ہے جو انہوں نے اس واقعہ کے بیان میں لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"فلما جلاهم (أي بني النضير) رسول الله صلى الله عليه وسلم من المدينة، وولي إخراجهم محمد بن مسلمة، فقالوا: إن لنا ديوناً على الناس إلى آجال، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تعجلوا وضعوا، فكان لأبي رافع سلام بن الحقيق على أسيد بن حضير عشرون ومائة دينار إلى سنة فصالحه على أخذ رأس ماله ثمانين ديناراً

وابطل ما فضل۔"

"حضور ﷺ نے قبیلہ بنو نضیر کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا اور حضرت محمد بن مسلمہ کو اس کا نگران مقرر فرمایا، اس وقت وہ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، اور آ کر کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین واجب ہیں، جن کی ادائیگی مختلف مدتوں پر ہونی ہے، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جلدی لے لو اور ساقط کر دو، اور ابی رافع سلام بن ابی الحقیق کے حضرت اسید بن حضیر کے ذمہ ایک سو بیس دینار دین تھے، جن کی واپسی سال گذرنے پر ہونی تھی، چنانچہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اصل راس المال جو اسی دینار تھے ان پر ان سے صلح کر لی اور جو زائد (سود) کے چالیس دینار تھے ان کو چھوڑ دیا۔"

(مغازی الواقدی ۱/۳۷۴، علامہ واقدی لکھتے ہیں کہ قبیلہ بنی قینقاع کی جلا وطنی کے وقت بھی یہی قصہ پیش آیا تھا، دیکھئے ۱/۱۷۹)

یہ روایت اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ دین کا جو حصہ ساقط کیا گیا تھا، وہ سود ہی تھا، اصل راس المال کا حصہ نہیں تھا۔

اس لئے جمہور علماء کے نزدیک "ضع وتعجل" (کچھ ساقط کر دو، اور فوراً دے دو) کا معاملہ حرام ہے، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"قال مالك: والأمر المكروه الذي لا اختلاف فيه عندنا أن يكون للرجل على الرجل الدين إلى أجل، فيضع عنه الطالب ويعجله المطلوب ...... قال مالك: وذلك عندنا بمنزلة الذي يؤخر دينه بعد محله عن غريمه ويزيده الغريم في حقه قال: فهذا الربا بعينه لا شك فيه."

"امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ امر مکروہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو، اور وہ (طالب) دائن دین کا کچھ حصہ ساقط کر کے بقیہ دین کا فوری مطالبہ کرے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ صورت ہمارے نزدیک اسی صورت ہی کی طرح ہے کہ کوئی شخص مدیون کو ادائیگی کی تاریخ

صورت ہے۔ (کتاب میں یہ بات نہیں پائی جا رہی ہے)

(معنی لابن قدامہ مع الشرح الکبیر: ۴/۱۷۴، ۱۷۵)

چنانچہ مندرجہ بالا تصریح میں حنابلہ کی بنیاد پر مدت کے مقابلے میں دین کے کچھ حصے کے متعلق درست کرنا قرار دیا گیا ہے۔

## فوری ادائیگی والے دیون میں "ضع وتعجل" کا اصول نافذ کرنا:

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہو رہا ہے کہ "ضع وتعجل" کی ممانعت صرف دیون مؤجلہ میں ہے، جہاں تک دیون حالہ کا تعلق ہے، یعنی وہ دیون جن کی ادائیگی کے بارے میں عقد کے اندر کسی مدت کو شرط قرار نہیں دیا گیا، بلکہ مدیون ان کی ادائیگی میں کسی بھی وجہ سے تاخیر کر رہا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسے دیون میں دین کے کچھ حصے کو چھوڑنے پر صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ مدیون باقی دین فوراً ادا کر دے، علماء مالکیہ نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے، چنانچہ المدونۃ الکبریٰ میں ہے کہ:

"قلت: أرأيت لو أن لي على رجل ألف درهم قد حلت، فقلت: اشهدوا أنه إن أعطاني مائة درهم عند رأس الشهر فالتسع مائة درهم له، وإن لم يعطني فالألف كلها عليه، قال مالك: لا بأس بهذا، وإن أعطاه رأس الهلال فهو كما قال، وتوضع عنه التسع مائة، وإن لم يعطه رأس الهلال فالمال كله عليه."

(المدونة الكبرى: ۱۱/۲۷ آخر كتاب الصلح)

"میں نے ان سے کہا کہ اس مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر ایک شخص کے ذمہ میرے ایک ہزار درہم دین ہوں اور ان کی ادائیگی کا وقت آ چکا ہو اور میں اس سے کہوں کہ اگر تم نے مہینہ شروع ہونے پر سو درہم ادا کر دیے تو نو سو درہم تمہارے ہیں، اور اگر تم نے ادا نہیں کیے تو پھر پورے ایک ہزار درہم ادا کرنے پڑیں گے؟ اس کے جواب میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اگر وہ مہینے کے شروع میں سو درہم ادا کر دے تو پھر ایسا ہی ہوگا جیسے تم نے کہا اور نو سو درہم اس سے ساقط ہو جائیں گے، اور اگر مہینے کے شروع میں اس نے سو درہم ادا نہیں کیے تو پھر پورا دین اس کے ذمہ رہے گا۔"

پھر اس کے بعد اسی قسم کا ایک اور مسئلہ ذکر فرمایا کہ:

"قلت: أرأيت لو أن لي على رجل مائة دينار ومائة درهم حالة، فصالحته من ذلك على مائة دينار ودرهم نقدا، قال: لا بأس بذلك."

(المدونة الكبرى، ۱۱/۲۷، آخر كتاب الصلح)

میں نے ان سے کہا کہ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر کسی کے ذمہ میرے ایک سو دینار اور ایک سو درہم فی الحال واجب ہوں اور میں اس سے سو دینار اور ایک درہم نقد پر صلح کرلوں تو کیا یہ جائز ہے؟ امام مالک نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وما ذكره عن عيسى هو في نوازله من كتاب المديان والتفليس ونصه: وسئل عن الرجل يقول لغريمه وقد حل حقه: ان عجلت لي كذا وكذا من حقي فبقيته عنك موضوع، ان عجلته لي نقدا ساعة، او الى اجل يسميه، فيعجل له نقدا، او الى الاجل، الا الدرهم او النصف او اكثر من ذلك، هل تكون الوضيعة لازمة؟ فقال: ما ارى الوضيعة تلزمه، اذا لم يعجل له جميع ذلك، وارى الذي له الحق على شرطه، قال محمد بن رشد: هذه مسالة يتحصل فيها اربعة اقوال: احدها قوله في هذه الرواية، وهو قول اصبغ في الواضحة ومثله في آخر كتاب الصلح من المدونة ان الوضيعة لا تلزمه، الا ان يعجل له جميع ماشرط الى الاجل الذي سمى، وهو اصح الاقوال."

"نوازل کی کتاب المدیان والتفلیس میں عیسیٰ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر ایک شخص اپنے غریم (مدیون) سے کہے جس کے دین کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو: اگر تم نے میرا اتنا حق ادا کردیا تو بقیہ دین معاف ہے، یا تو تم ابھی نقد ادا کرو، یا فلاں وقت تک ادا کردو، لہٰذا اگر مدیون فوراً ادا کردے، یا اس کی مقرر کردہ مدت پر ادا کردے مگر صرف ایک درہم یا نصف درہم یا کچھ زیادہ باقی رہ جائے تو کیا اس صورت میں بھی دائن کے لئے اسقاط دین لازم ہوگا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ جواب میں فرمایا کہ میری رائے میں اگر مدیون

نے پوری رقم ادا نہیں کی تو اس صورت میں اسقاط دین وانش پر لازم نہیں ہوگا، اور میری رائے میں اسقاط دین شرط اور پر موقوف تھا جو ابن رشد فرماتے ہیں کہ اس میں چار اقوال ہیں، اور ایک وہی ہے جو اس روایت میں ہے، اور یہی اصح اور واضح کا قول ہے اور مدونۃ الکبریٰ کی کتاب العطیہ کے آخر میں بھی یہی قول مذکور ہے، وہ یہ کہ وانش پر دین کی کمی اس وقت تک لازم نہیں ہوگا جب تک مدیون مقررہ مدت پر پورا دین ادا نہ کردے، اور یہی سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔"

(تحریر الکلام فی مسائل الالتزام للحطاب: ص ۲۳۳- دیکھئے فتح العلی المالک ۱: ۲۸۹)

یہ عبارات اس بارے میں بالکل صریح ہیں کہ علماء مالکیہ کے نزدیک دیون حالہ میں "ضع وتعجل" کا اصول جاری کرنا جائز ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ فقہاء مالکیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ متفق ہیں، اس لئے کہ دوسرے علماء نے جہاں بھی "ضع وتعجل" کے حرام ہونے کا ذکر کیا ہے، وہاں "دیون مؤجلہ" کی قید بھی لگائی ہے، جیسا کہ موطا میں امام محمد بن حسن کی ذکر کردہ عبارت اور اس پر قائم کئے گئے ترجمۃ الباب سے یہی ظاہر ہو رہا ہے، اسی طرح علامہ ابن قدامہؒ نے بھی اس مسئلہ کو "دین مؤجل" کے ساتھ مقید کیا ہے (دونوں کی عبارات پیچھے گذر چکی ہیں)، اور یہ بات بداہت کے ساتھ ثابت ہے کہ کتب فقہ میں مفہوم مخالف حجت ہوتا ہے، لہٰذا اس سے ظاہر ہوا کہ دیون حالہ میں "ضع وتعجل" جائز ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بعض دین ساقط کرنے کے بارے میں حضرت کعب اور حضرت ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہما کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"فقال اهل العلم في التطبيق بينه وبين هذه الآثار ان الآثار في المؤجل، وهذا في الحال، وفي كتاب الرحمة: اتفقوا على ان من كان له دين على انسان الى اجل، فلا يحل له ان يضع عنه بعض الدين قبل الاجل ليعجل له الباقي ... على انه لا بأس اذا حل الاجل ان يأخذ البعض ويسقط البعض." (المسوى على المصفى: ۲/ ۲۸۳)

"اہل علم اس واقعہ کے درمیان اور ان آثار کے درمیان جو "ضع وتعجل" کے بارے مروی ہیں، اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ ان آثار اور روایات کا تعلق دین مؤجل سے ہے، اور یہ واقعہ دین حال سے متعلق ہے، اور کتاب الرحمۃ میں ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے پر کسی مدت کے لئے

دین واجب ہو تو اس کو مدت کے آنے سے پہلے ادا کرنا جائز نہیں کہ دین کا کچھ حصہ معاف کر دے تاکہ بقیہ دین فوراً وصول کر لے ... ہاں اس میں کوئی حرج نہیں کہ جب دین کی ادائیگی کا وقت آجائے اس وقت کچھ دین وصول کر لے اور باقی معاف کر دے۔"

دونوں مسئلوں اور دونوں حالتوں میں فرق اس لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ دین حال میں مدت کی شرط نہیں ہوتی اور "تاخیر" مدیون کا حق نہیں ہوتا۔ لہٰذا جبکہ اس میں "مدت" متعین ہی نہیں ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دین کا جو حصہ معاف کر دیا ہے، وہ "مدت" کے عوض معاف کیا ہے، لہٰذا اس میں ربا کے معنی نہیں پائے جاتے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرض حسن، حنفیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک موجل کرنے سے موجل نہیں ہوتا (یعنی قرض میں مدت مقرر کرنے سے وہ مدت لازم نہیں ہوتی) مالکیہ کے نزدیک قرض موجل ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وإن أجل القرض لم يتأجل، وكان حالا، وكل دين حل أجله لم يصر مؤجلا بتأجيله، وبهذا قال الحارث العكلي والأوزاعي وابن المنذر والشافعي، وقال مالك والليث: يتأجل الجميع بالتأجيل ... وقال أبو حنيفة في القرض وبدل المتلف كقولنا"

قرض موجل کرنے سے موجل نہیں ہوتا، بلکہ ادائیگی فوری واجب رہے گی، اور ہر وہ دین جس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو، اب وہ دین موجل کرنے سے موجل نہیں ہوگا۔ امام حارث عکلی، امام اوزاعی، ابن منذر اور امام شافعی کا بھی یہی قول ہے، اور امام مالک اور امام لیث فرماتے ہیں کہ ہر قرض موجل کرنے سے موجل ہو جاتا ہے۔ قرض اور ہلاک شدہ چیز کے بدل کے بارے میں امام ابو حنیفہ کا بھی وہی قول ہے جو ہمارا ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اختلف العلماء في تأجيل الدين إلى أجل، فقال أبو حنيفة وأصحابه: سواء كان القرض إلى أجل أو غير أجل، له أن يأخذه متى أحب، وكذلك العارية وغيرها، لأنه عندهم من باب العدة والهبة غير مقبوضة، وهو قول الحارث العكلي وأصحابه وإبراهيم النخعي،

## تعجیل کی صورت میں بلا شرط کے دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

دین مؤجل کو جلد ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب یہ "چھوڑنا" تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ قرض خواہ اپنی خوشی سے دین ساقط کر دے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں، چنانچہ علامہ جصاص رحمۃ اللہ علیہ "ضع وتعجل" کے جواز پر جتنے آثار اور روایات ملی ہیں ان کو اسی پر محمول کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ومن اجاز من السلف اذا قال: عجل لي وضع عنك، فجائز ان يكون اجازوه اذا لم يجعله شرطا فيه، وذلك بان يضع عنه بغير شرط، ويعجل الآخر الباقي بغير شرط.

(احکام القرآن للجصاص: ۱/۴۶۷، آیت ربا)

جن اسلاف نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے کہے کہ "تم میرا دین جلدی ادا کر دو، میں تمہیں کچھ دین معاف کر دوں گا" بظاہر انہوں نے جواز کا یہ قول اس صورت میں اختیار کیا ہے، جبکہ دین میں کمی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو، دائن بغیر شرط کے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دے اور مدیون بغیر کسی شرط کے دین جلدی ادا کر دے۔

(ماخوذ از فقہی مقالات: ۱/۱۰۰ـ۱۶۵)

## میراث سے صلح (تخارج) کے چار اہم مسائل:

تخارج کی چند صورتوں کو وضاحت کے لئے سوال و جواب کی صورت میں نقل کئے دیتے ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

سوال ۱: ایک آدمی کو وفات پائے عرصہ پانچ سال گزر گیا، اس نے ورثاء میں ایک بیوی پانچ لڑکے چھ لڑکیاں چھوڑی ہیں وفات ہونے کے بعد فوراً جائیداد تقسیم کر دی گئی، جائیداد غیر منقولہ میں ۱۳۵ گز میں ایک گھر اور ایک پلاٹ تھا، اور منقولہ جائیداد میں نقد پیسے، زیورات اور گھریلو سامان تھا، گھر کا سامان، زیورات، نقد پیسے، دو جانوروں کی قیمت لگائی گئی اور ساتھ ہی بڑے لڑکے پر جو تیرہ سو روپے قرض تھا وہ بھی اس قیمت میں جمع کیا گیا، کل رقم چودہ ہزار روپے بنی جو ورثاء کے حصص کے مطابق تقسیم کر کے ہر ایک وارث کا حصہ متعین کر دیا گیا، پھر تمام بڑی

ترکہ منقول کی تقسیم میں اس کی قیمت لگا کر تقسیم کرنے کا دستور ہے، اور ظاہر ہے کہ کل ورثاء کی رضامندی سے ایک کو دوسروں کے حصہ میں محسوب کیا جائے گا۔

[illegible]

مسئلہ مذکورہ میں یہی صورت ہے، اس لئے یہ بھی صحت سے مانع نہیں۔

۳۔ اگر بدل صلح ترکہ سے نہیں قرار پایا، بلکہ عاقد اپنے پاس سے ادا کرتا ہے تو یہ تخارج مطلقاً صحیح ہے اور اگر ترکہ سے بدل صلح قرار پایا تو اس میں چونکہ سب ورثاء کا حق ہے اس لئے اس کی صحت کے لئے سب کی رضامندی شرط ہے۔

قال العلائي رحمه الله تعالى: ولو اخرجوا واحدا من الورثة فحصته تقسم بين الباقي على السواء ان كان ما اعطوه من مالهم غير الميراث وان كان المعطى مما ورثوه فعلى قدر ميراثهم يقسم بينهم، وقال ابن عابدين رحمه الله تعالى: افاد ان احد الورثة اذا صالح البعض دون الباقي يصح وتكون حصته له فقط كذا لو صالح الموصى له كما في البزازي ساتحاني. (ردالمحتار: ٤/٥٣٧)

قلت: في مسألتنا وقع التخارج بتراضي الورثة فاندفع هذا الاشكال ايضا لكن بقي رضا الصغير وسياتي حكمه.

۴۔ بدل صلح خواہ کتنا ہی قلیل ہو تخارج جائز ہے، البتہ اگر کسی کے ساتھ یوں دھوکا ہوا کہ بوقت صلح وہ کسی چیز کی صحیح قیمت سے آگاہ نہ تھا بعد میں غبن فاحش ظاہر ہوا تو اس کو قاضی سے صلح فسخ کرانے کا اختیار ہے۔

في شرح التنوير: ولو ظهر غبن فاحش لا يدخل تحت التقويم في القسمة فان كانت بقضاء بطلت اتفاقا لان تصرف القاضي مقيد بالعدل ولم يوجد ولو وقعت بالتراضي تبطل ايضا في الاصح لان شرط جوازها المعادلة ولم توجد فوجب نقضها خلافا لتصحيح الخلاصة قلت فلو قال كالكنز تفسخ لكان اولى وتسمع دعواه ذلك اي ما ذكر من الغبن الفاحش ان لم يقر بالاستيفاء وان اقر به لا.

وفي الهامش: (ولو ظهر غبن فاحش في القسمة) أي في التقويم للقسمة بأن قوم بألف فظهر أنه يساوي خمس مائة.

وفيها تحت (قوله تفسخ الخ) فمقتضاه أنها تحتاج إلى الفسخ وأن معنى تبطل يبطل له إبطالها وبه يشعر قول الكنز تفسخ حيث لم يقل تنفسخ. (رد المحتار: ۵/۱۸۷)

علائیہ کی عبارت مذکورہ سے بعض کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں بوجہ غبن فاحش تخارج باطل ہے، حالانکہ علائیہ وشامیہ کی عبارت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ تخارج کے بعد غبن فاحش کے ظہور سے خیار فسخ ہے اور اس کا دعویٰ مسموع ہے، غبن کہتے ہی اس نقصان کو ہیں جو عقد کے بعد ظاہر ہو، بوقت عقد جو نقصان ظاہر و معلوم ہو وہ خواہ کتنا ہی فاحش ہو غبن نہیں۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تخارج میں بدل صلح کی کوئی تعیین مشروط نہیں، معہذا تسکین خاطر خام کے لئے چند امور تحریر کئے جاتے ہیں:

(۱) کتب مذہب میں تصریح ہے کہ بدل صلح سونا یا چاندی، یا مکیل یا موزون ہو تو صحت تخارج کے لئے یہ شرط ہے کہ بدل صلح اس چیز میں مصالح کے حصے سے زائد ہو، آگے یہ کوئی شرط نہیں کہ کل ترکہ سے اس حصہ کی کیا نسبت ہو، اور اگر بدل صلح اشیاء مذکورہ سے نہ ہو تو اس میں کوئی تعیین بھی مشروط نہیں۔

(۲) تخارج بحکم بیع ہے اور بیع میں بتراضی متعاقدین بدلین میں تفاوت کثیر جائز ہے۔

(۳) قال ابن عابدين رحمه الله تعالى: أوصى لرجل بثلث ماله ومات فالموصي صالح الوارث الموصى له من الثلث بالسدس جاز الصلح وذكر الإمام المعروف بخواهر زاده أن حق الموصى له وحق الوارث قبل القسمة غير متأكد يحتمل السقوط بالإسقاط الخ.

(رد المحتار: ۵/۶۴۲)

اس میں اسقاط بعوض مراد ہے، مطلق اسقاط صحیح نہیں کما حررت في كتاب الوصية والفرائض تحت عنوان "وارث کا حق اس کے اسقاط سے ساقط نہیں ہوتا" (احسن الفتاوی جلد ۹ میں)۔

اسقاط یا الصلح کی مثال کی عبارت مذکورہ میں صلح من الثلث بالسدس مذکور ہے جس میں تضعیف و تنصیف کی نسبت ہے اور خود علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے غبن فاحش کی مثال میں یہی نسبت بیان فرمائی ہے۔

کما مر فی تتمه: بأن قوم بالف فظهر انه يساوی خمس مائة.

اس سے ثابت ہوا کہ تفاوت فاحش کے باوجود تخارج جائز ہے۔

(٤) اگر صغیر خود عاقد ہو تو بیع و شراء وغیرہ عقود دائرہ بین النفع والضرر کی طرح عقد صلح میں بھی صغیر کا عاقل ہونا شرط ہے، بلوغ شرط نہیں۔

صغیر غیر عاقل کا عقد منعقد نہیں ہوتا اور عاقل غیر ماذون کا عقد منعقد ہو جاتا ہے، مگر اذن بعد البلوغ یا اذن ولی پر موقوف ہے۔

ولی فی المال بالترتیب یہ ہیں:

باپ، اس کا وصی، دادا، اس کا وصی، قاضی۔

فی صلح شرح التنویر: وشرطه العقل لا البلوغ والحرية فصح من صبي مأذون ان عری صلحه عن ضرر بین.

(رد المحتار: ٤/٥٢٦)

وفي الهندية: واما شرائطه فانواع منها ان يكون المصالح عاقلا فلا يصح صلح المجنون والصبي الذي لا يعقل هكذا في البدائع.

(عالمگیریة: ٤/٢٢٩)

وفي كتاب المأذون من شرح التنوير: وتصرف الصبي والمعتوه الذي يعقل البيع والشراء ان كان نافعاً محضا كالاسلام والاتهاب صح بلا اذن وان كان ضاراً كالطلاق والعتاق والصدقة والقرض لا وان اذن به وليهما وما تردد من العقود بين نفع وضرر كالبيع والشراء توقف على الاذن حتى لو بلغ فاجازه نفذ فان اذن لهما الولي فهما في شراء وبيع كعبد مأذون في كل احكامه. (رد المحتار: ٥/١٢١)

اور اگر صبی خود مباشر عقد نہ ہو بلکہ اس کی طرف سے کوئی دوسرا عقد کرے تو صبی کا عاقل ہونا

غيره نفعلى مقتضاه أنها لا تنفذ بالإجازة فليتأمل .

وعبارة المنية هكذا : قسم الورثة لا بأمر القاضي وفيهم صغير أو غائب لا تنفذ إلا بإجازة الغائب أو ولي الصغير أو يجيز إذا بلغ القسم بين الشركاء فيما بينهم وفيهم صغير أو غائب لا تصح القسمة فإن أمرهم القاضي بذلك صح .

أقول : سيذكر المصنف بعد أسطر أنهم لو كانوا مشترين وغاب أحدهم فكيف تصح قسمة الشركاء بأمر القاضي ، اللهم إلا أن يراد به الشركاء في الميراث لكن ينفي قول الشارح ولو شركاء بطلت محتاجا إلى نقل ، نقل الزاهدي في قنيته : قسمت بين الشركاء وفيهم شريك غائب فلما قدم قص عليها قال لا أرضى لكن فيها ثم أذن لحراثه في زراعة نصيبه لا يكون رضا بعد ما رد فليحرر وو لا تنس ما قدمناه من أن للشريك أخذ حصته من المثلي بغيبة صاحبه وما نقله عن الخانية فإنه مخصص لما هنا .

( رد المحتار : ٥/ ١٨٠ )

وقال الرافعي رحمه الله تعالى : ( قوله الظاهر رجوعه للمستثنيات الثلاث ) يدل له ما نقله في المنح عن السراج بقوله وليس لهم أن يقسموا إلا بقضاء إذا تراضوا إلا أن يكون فيهم صغير لا ولي له أو غائب لا وكيل عنه فحينئذ لا تجوز بالاصطلاح بل لا بد من القاضي لأنه لا ولاية لهم على الصغير ولا على الغائب فإن أمر القاضي بها جاز على الصغير والغائب لأن له ولاية على الصغير ونظراً على الغائب وتصرفه يصح على الميت ( قوله لكن ينفي قول الشارح ولو شركاء بطلت محتاجا إلى نقل ) .

علل البطلان الرحمتي في هذه المسألة بأن كل واحد أجنبي في حق صاحبه فلم يوجد قابل عن الصغير ونحوه وشرط عقد الفضولي

نصیبه إلی الوارث ولا ینقض بأن أسقطوا لا یعود ... الخ (ص ۳۳۳)

صورت مسئولہ میں تخارج صلح جائز نہیں کیونکہ ورثاء میں نابالغ بھی ہیں اور نابالغ کے حق میں صلح مفید بھی ہو اور تخارج صلح معتبر ہے اور تخارج صلح بدون تراضی ورثاء درست نہیں اور نابالغ کی رضا معتبر نہیں، دوسری اس صلح میں استغاثہ بحقوق واسقاط بحقوق ہے۔ معاوضہ کی صورت نہیں اس سے بڑی عمر والے ورثاء بالغین کے حق میں بھی صلح منعقد نہیں ہو سکتی پس زوجہ نے جو اشیاء اول سے لی ہیں وہی اس کا حق ہے باقی کے چھ سہم لڑکے ایک سہم ماں کا ایک سہم باپ کا حق ہے اور چار سہم لڑکوں کے ہیں دو ایک کے دو ایک کے۔ واللہ اعلم

(ماخوذ از ملحقات الاحکام ج ۲ ص ۱۴۶)

# احکام الوقف

## الوقف لغۃ:

الحبس یقال: وقف داره أو ماله في سبیل الله أي حبسها وخصصها في وجوه الخیر طلبا لمرضاة الله. ولا یقال أوقف إلا في لغة ردیئة والأفصح أن یقال: وقفها.

وقف کے لغوی معنی روکنا، لہٰذا وقف مال فی سبیل اللہ کا معنی ہے: مال کو نیک کاموں میں خرچ کرنے کے لئے خاص کر دینا۔

## الوقف شرعا:

هو إخراج شيء من ملکه وجعله ملکا لله عز وجل، موقوفا في وجوه الخیر کالمسجد، والمدرسة والمستشفى، وإجراء الماء، وسقي الحجاج والمعتمرین، وسائر وجوه الخیر والإحسان، ابتغاء الأجر والثواب وهذا ما یسمى الوقف الخیري. (فقه المعاملات)

وقف کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ اپنی مملوکہ مال کو اپنی ملک سے نکال کر اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کر دینا اور وجوہ خیر، مساجد، مدارس، ہسپتال، پانی کا کنواں، حجاج کرام اور معتمرین کو پانی پلانا، اسی طرح دیگر کار خیر کے واسطے خاص کر دینا وقف ہے۔

## وقف کی مشروعیت:

اپنے اموال کو کار خیر کے لیے وقف کرنا یہ شرعاً مطلوب ومحمود ہے انسان کے انتقال کے بعد ایک عرصہ دراز تک اجر وثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جوانی، صحت وعافیت، وتندرستی کے زمانہ میں اعمال صالحہ میں عام طور پر کمی کوتاہی ہو جاتی ہے، اور آخری عمر میں مؤمن میں اعمال صالحہ کی رغبت بڑھ جاتی ہے، لیکن قویٰ کمزور ہونے کی وجہ سے جوانی وصحت کے زمانہ کی طرح اعمال انجام دینے پر قدرت برقرار نہیں رہتی، دوسری طرف موت کا وقت قریب نظر آتا ہے، اور آخرت کے لئے زیادہ سے زیادہ اجر وثواب حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے، تو شریعت مطہرہ نے بعض ایسے اعمال بتلائے کہ انسان کے مرنے کے بعد بھی ان کا ثواب برابر پہنچتا رہتا ہے، انہی اعمال میں سے ایک "وقف للہ" بھی ہے۔

كما روى عن النبي صلى الله عليه وسلم: اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلاث، صدقة جارية، او علم ينتفع به، أو ولد يدعوله. (مسلم رقم ١٦٣١، في الوصية، ترمذي: ١٣٧٦، ابو داؤد، ٢٨٨٠، نسائي ٦/٢٥١، في الوصايا)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، جب انسان کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ پر اجر وثواب کا ملنا بند ہو جاتا ہے مگر تین اعمال کے ثواب جاری رہتا ہے۔

(۱) صدقہ جاریہ۔
(مثلاً کوئی مسجد بنوا دی، سبیل لگوا دی، پانی کا کنواں کھدوا دیا، قرآن کریم کا مکتب مدرسہ بنوا دیا، وغیرہ)

(۲) یا علم دین چھوڑ کر گیا جس سے لوگ فائدہ حاصل کرتے رہے، (مثلاً کسی کو دین کی تعلیم دی، کسی کو قرآن وحدیث پڑھایا، یا کوئی دینی کتاب تصنیف کی، یا قرآن کریم چھپوا کر تقسیم کیا وغیر ذالک)

(۳) یا کوئی صالح اولاد چھوڑ کر مرا جو اس کے حق میں دعا کرتی رہتی ہے۔

(مسلم، ترمذی وغیرہ)

اس روایت میں صدقہ جاریہ سے مراد وقف ہی ہے جس شکل میں بھی ہو۔

يستأمره فيها، أي يستشيره ماذا يصنع بها، فقال: يا رسول الله! إني أصبت أرضا بخيبر، لم أصب قط مالا أنفس عندي منه، فما تأمرني فيها؟

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن شئت حبست أصلها، أي وقفتها في سبيل الله، وتصدقت بها، غير أنه لا يباع أصلها ولا يبتاع، أي ولا يشترى، ولا يوهب ولا يورث!!

قال: فتصدق بها عمر في الفقراء، وذوي القربى، والرقاب وابن السبيل، والضيف، لا جناح، أي لا إثم على من وليها أن يأكل منها، أو يطعم صديقا بالمعروف، غير متأثل فيه مالا، أي غير متكسب منها المال.

فهذا وقف للأرض، وما يكون فيها من ثمر، من أمير المؤمنين عمر رضي الله عنه وأرضاه.

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک زمین ملی تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس زمین کے بارے میں مشورہ کیا، کہ یا رسول اللہ یہ زمین میرے لئے بہترین عمدہ اور پسندیدہ مال ہے، آپ مشورہ دیں کہ میں اس زمین کو کس مصرف میں لاؤں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو اس کو اللہ کے لئے وقف کردیں اس طرح کہ پھر یہ زمین نہ فروخت ہو سکے گی، نہ کسی اور کو ہبہ ہو سکے گی، نہ ہی آپ کے انتقال کے بعد اس میں وراثت جاری ہوگی، ابن عمر فرماتے ہیں، اس مشورہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس زمین کو وقف فرما دیا، فقراء، قرابت دار، مسافر، غلام آزاد کرنے وغیرہ مصارف پر اس کی آمدن کو خرچ کیا جائے، اسی طرح جو اس وقف کا متولی ہوگا وہ بھی ضرورت کے وقت اس کی آمدن کو استعمال کر سکے گا البتہ متولی اس وقف کو مال جمع کرنے کا ذریعہ بنائے۔

گویا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے زمین اور اس کے پھلوں کا وقف ہوا۔

## حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا وقف:

وروى الشيخان عن أنس رضي الله عنه أنه قال:

"كان أبو طلحة رضي الله عنه أكثر الأنصار بالمدينة مالاً من نخل، وكان أحب أمواله إليه "بيرحاء" وكانت مستقبلة المسجد، وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يدخلها ويشرب من ماء فيها طيب، قال أنس: فلما نزلت هذه الآية: "لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون" قام أبو طلحة إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: يا رسول الله! إن الله تبارك وتعالى يقول: "لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون" وإن أحب مالي إلي "بيرحاء" وإنها صدقة لله تعالى، أرجو برها وذخرها عند الله تعالى، فضعها يا رسول الله حيث أراك الله!

فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: بخ! ذلك مال رابح، ذلك مال رابح، وقد سمعت ما قلت، وإني أرى أن تجعلها في الأقربين! فقال أبو طلحة: أفعل ذلك يا رسول الله فقسمها أبو طلحة في أقاربه وبني عمه".

(أخرجه البخاري برقم: ١٤٦١، ومسلم برقم: ٩٩٨)

فدل هذا الحديث الشريف على أن الوقف جائز في "الوقف الأهلي" كما هو جائز في الوقف الخيري، وقد أشار عليه صلى الله عليه وسلم أن يجعلها في أقربائه لعلمه بفقرهم.

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ مدینۃ الرسول ﷺ میں مالدار ترین انصاری صحابی میں سے تھے، ان کا سب سے پسندیدہ مال "بیرحاء" نامی کھجور کا باغ تھا، وہ مسجد نبوی ﷺ کے سامنے کی جانب تھا، رسول اللہ ﷺ اس باغ میں تشریف لے جاتے اور عمدہ میٹھا پانی نوش فرماتے، جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: "لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون" یعنی تم نیکی کامل کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے، تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے اور میرا پسندیدہ

مال "بیرحاء" ہی ہے اس کو اللہ کی راہ میں وقف کرتا ہوں، میں اللہ تعالی سے اس کے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں، اے اللہ کے رسول آپ اس کو جس کار خیر میں چاہیں خرچ فرمائیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ذرا تو قف کرو، غور و فکر کرو، یہ ایک نفع بخش مال ہے، میں نے آپ کی پوری گفتگو سن لی ہے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ اس کو اپنے خاندان کے افراد کے لئے وقف کریں، تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ میں اس کو اپنے خاندان کے افراد پر وقف کرتا ہوں، چنانچہ ابو طلحہؓ نے اس کو اپنے خاندان کے محتاج افراد پر تقسیم کر دیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا عام اوقاف کی طرح خاندان کے مستحق افراد کے حق میں وقف کرنا بھی جائز ہے۔

## وقف کا حکم:

جب کوئی انسان اپنے کسی مال کو اللہ تعالی کے لئے وقف کر دے، مثلاً یوں کہہ دے: "وقفت هذه الدار على فقراء المسلمين، او هذا وقف الله عزوجل في حياتي وبعد وفاتي" یعنی میں نے اس گھر کو فقراء مسلمین پر وقف کر دیا، یا یہ گھر اللہ کے لئے وقف ہے، میری زندگی اور میرے مرنے کے بعد، اب صرف زبان سے یہ مکمل جملہ کہہ دینے سے وقف تام ہو جائے گا، اور اس کی ملک سے موقوفہ زمین جائیداد نکل جائے گی یا کچھ اور بھی تصرف کی ضرورت ہے؟

اس بارے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ وقف تام ہونے اور موقوف کا واقف کی ملک سے نکلنے کے لئے دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا ہونا ضروری ہے:

(۱) حاکم فیصلہ کر دے کہ یہ وقف عام مسلمانوں کے لئے ہو گیا ہے۔

(۲) وہ واقف یوں کہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا گھر یا زمین جائیداد فلاں پر یعنی فلاں مسجد یا فلاں مدرسہ پر وقف ہے اب واقف کا انتقال ہوتے ہی اس کی ملک ختم ہو جائے گی لیکن صاحبین اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ صرف زبانی وقف کرنے سے وقف تام ہو جاتا ہے اور واقف کی ملک ختم ہو جاتی ہے، اب وقف سے رجوع کرنا جائز نہیں۔

وقد جاء في ملتقى الابحر قوله: الوقف عند ابي يوسف ومحمد هو حبس العين على ملك الله تعالى على وجه يعود نفعه الى العباد، ويلزم بزوال ملكه بمجرد القول وهو المختار للفتوى.

(ومشکوٰۃ المصابیح: [illegible])

## موت کے بعد جن اعمال کا ثواب جاری رہتا ہے:

پہلے مشروعیت کے تحت حدیث گذر چکی ہے کہ بعض اعمال کا ثواب موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے، ان میں سے تین کا تذکرہ اس حدیث کے ضمن میں گذر چکا ہے، دوسری حدیث میں اس سے زیادہ تفصیل ہے۔

كما أخرجه ابن ماجه في سننه عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال:

"إن مما يلحق المؤمن من عمله وحسناته بعد موته علما نشره، وولدا صالحا تركه، أو مصحفا ورثه، أو مسجدا بناه، أو بيتا لابن السبيل بناه، أو نهرا أجراه، أو صدقة أخرجها من ماله في صحته وحياته تلحقه بعد موته"

(أخرجه ابن ماجه رقم: ٢٤٢ في المقدمة)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جن اعمال کا ثواب انسان کو موت کے بعد بھی ملتا رہتا ہے ان میں سے (۱) ایک علم ہے جس کی اس نے اشاعت کی (۲) نیک اولاد جس کو پیچھے چھوڑ کر گیا ہو (۳) قرآن کریم جو وراثت میں چھوڑا ہو (۴) مسجد تعمیر کی ہو (۵) یا کوئی مسافر خانہ بنایا ہو (اس دور میں اس کی بہترین مثال مدارس ہیں جہاں مسافر طلبہ قیام کرتے ہیں) (٦) پانی کے لئے نہر جاری کی ہو (تاکہ لوگ اس سے پانی پئیں) (۷) صدقہ جو اس نے زندگی میں صحت و تندرستی کے زمانہ میں نکالا ہو، اس حدیث میں سات کا تذکرہ ہے، امام سیوطی نے دس تک گنوائے ہیں، ان کو چند ابیات میں نظم کیا ہے۔

حيث قال:

إذا مات ابن آدم ليس يجري
عليه من فعال غير عشر
علوم بثها ودعاء نجل
وغرس النخل والصدقات تجري

ورثة مصحف، ورباط ثغر
وحفر بئر، أو إجراء نهر
وبيت للغريب بناه يأوي
إليه، أو بناء محل ذكر

(فقه المعاملات)

## اشیاء منقولہ وقف کرنے کا حکم:

جس طرح زمین اور جائیداد، غیر منقول اشیاء کا وقف جائز ہے، اسی طرح منقول اشیاء کا وقف بھی جائز ہے، مثلاً قرآن کریم، کتب دینیہ، گھوڑے، اسلحہ وغیرہ، صحابہ کرام سے ان اشیاء کا وقف بھی ثابت ہے۔

قال الحميدي: تصدق أبو بكر بداره بمكة على ولده، فهي إلى اليوم، وتصدق عمر بربعه عند المروة على ولده، وتصدق عثمان ببئر رومة، كانت البئر ملكاً ليهودي فاشتراها عثمان وجعلها صدقة على المسلمين، وتصدق علي بأرضه بينبع، وتصدق سعد بداره بالمدينة وتصدق عمرو بن العاص ببستان له بالطائف، وذلك كله إلى اليوم.

قال جابر: لم يكن أحد من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم ذو مقدرة إلا وقف، واشتهر ذلك فلم ينكره أحد، فكان إجماعاً.

(المغني لابن قدامة: ٥٩٨/٥)

وروى البخاري عن "عمرو بن الحارث" قال: ما ترك رسول الله صلى الله عليه وسلم عند موته ديناراً ولا درهماً، ولا عبداً ولا أمةً، ولا شيئاً إلا بغلته البيضاء، التي كان يركبها وسلاحه، وأرضاً جعلها لابن السبيل.

(أخرجه البخاري في الجهاد: [illegible]، برقم [illegible])

امام بخاری رحمہ اللہ نے عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے موت کے وقت کوئی درہم، دینار، غلام یا باندی اپنی ملک میں نہیں چھوڑا، سوائے اپنے سفید خچر

او حوض او حجر ا . فاخذه اللصوص والمتغلبون كما هو مشاهد .

(رد المحتار كتاب الوقف : ج ۳)

مسجد کا دوسری قسم کا سامان جس کا بنائے مسجد میں کوئی دخل نہیں، جیسے چٹائی اور فانوس وغیرہ جنہیں آلات المسجد کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس مسجد میں ضرورت نہیں تو اس کا دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز ہے، بشرطیکہ واقف بھی اجازت دے، اس لئے کہ ایسا سامان بوقت استغناء ملک واقف میں عود کر آتا ہے، لہٰذا واقف کا اذن ضروری ہے۔

قال في الشامية تحت (قوله ومثله حشيش المسجد الخ) قال الزيلعي وعلى هذا حصير المسجد وحشيشه اذا استغنى عنهما يرجع الى مالكه عند محمد رحمه الله تعالى وعند ابي يوسف رحمه الله تعالى ينقل الى مسجد آخر وعلى هذا الخلاف الرباط والبئر اذا لم ينتفع بهما اه وصرح في الخانية ان الفتوى على قول محمد رحمه الله تعالى قال في البحر وبه علم ان الفتوى على قول محمد رحمه الله تعالى في آلات المسجد .

(رد المحتار: ج ۳، ماخوذ از احسن الفتاوی: ٢٢٦/٦)

## سرکاری زمین میں بلا اجازت مسجد کا بڑھانا:

سوال: ایک مسجد تنگ ہے، اس کے بڑھانے کی سخت ضرورت ہے، لوگ بیچارے بہت پریشان ہیں، مگر مسجد کے ساتھ متصل سرکاری زمین ہے اور گورنمنٹ مسجد کو بڑھانے کی اجازت نہیں دیتی، اس صورت میں بلا اجازت مسجد کو وسیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اس کا حکم یہ ہے کہ حکومت پر مساجد کا انتظام اور تعمیر بقدر ضرورت فرض ہے، لہٰذا اگر حکومت اپنا فرض ادا نہیں کرتی تو بلا اذن حکومت زمین پر تعمیر جائز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

## قبرستان کا درخت کاٹنا:

جن درختوں کے متعلق لوگوں کا شرکیہ عقیدہ ہو کہ یہ فلاں بزرگ یا فلاں پیر صاحب کے درخت ہیں جو انہیں ہاتھ لگائے گا اس پر آفت آجائے گی، ان کا کاٹنا عقیدۂ شرکیہ کے ابطال کے لئے ضروری ہے، مگر انہیں فروخت کرکے ان کی قیمت اسی قبرستان پر خرچ کی جائے، اگر اسی

قبرستان میں کوئی مصرف نہ ہو تو دوسرے کسی قریبی قبرستان پر لگائی جائے۔

یہ حکم جب ہے کہ درخت خودرو ہوں۔ اگر کسی شخص نے لگائے ہیں تو وہ اس کی ملک ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (ماخوذ از احسن الفتاویٰ: ۶/ ۴۴۲)

## قبرستان کے درخت سے مسواک کرنا:

وقف قبرستان کے خودرو درخت بھی وقف ہیں ان سے مصارف وقف کے علاوہ نفع اٹھانا جائز نہیں۔

## قبرستان کے درختوں کو فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ایک قبرستان میں بڑے بڑے درخت ہیں جن کو فروخت کر کے ان کی قیمت اگر قبرستان میں ہی لگا دی جائے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جہاں کہیں درخت زمین کے قبرستان بن جانے سے پہلے اگے ہوں تو مملوکہ زمین ہونے کی صورت میں درخت مالک زمین کے ہوں گے خواہ کوئی ایک شخص ہو یا قوم، البتہ زمین کے قبرستان بن جانے کے بعد درخت اگے ہوں اور یہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو، بلکہ عام مسلمانوں کے قبرستان کے لئے وقف ہو تو اس کے درخت فروخت کر کے ان کی قیمت قبرستان یا دوسرے اجتماعی مقاصد میں خرچ کی جا سکتی ہے۔

لما فی الهندية: مقبرة عليها اشجار عظيمة فهذا على وجهين اما ان كانت الاشجار قبل اتخاذ الارض مقبرة او نبتت بعد اتخاذ الارض مقبرة ففى الوجه الاول المسألة على قسمين اما ان كانت الارض مملوكة لها مالك او كانت مواتا لا مالك لها واتخذها اهل القرية مقبرة. (الفتاوى الهندية: ۲/ ۴۷۳، الباب الثاني عشر الخ)

وقال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري: مقبرة عليها اشجار ان كانت نابتة قبل اتخاذ الارض مقبرة والارض مملوكة لها مالك جعلها مقبرة فالاشجار باصلها على ملك رب الارض يصنع الورثة بالاشجار ما شاؤا الان الشجرة لا تدخل تحت الوقف وان كانت الارض مواتا لا مالك لها بنصلها على حالها القديمة هكذا وان كانت الاشجار نابتة

الحادها مقبرة ولم يبق بعد ذلك لا يخلو اما ان علم غارسها او لا يعلم

ان علم كانت للغارس وان لم يعلم بها غارس فالحكم للقاضي .

(خلاصة الفتاوى، ٤/٤٢٩، كتاب الوقف الفصل الثالث، نوع آخر،

ومثله في البحر الرائق، ٥/٢٠٦، كتاب الوقف)

## مرض الموت میں وقف کرنے کا حکم:

اگر کوئی انسان مرض الموت میں وقف کرے، تو یہ وقف وصیت کے حکم میں ہوگا، لہٰذا میت کے تہائی مال تک نافذ ہوگا، اس سے زائد میں نافذ نہ ہوگا، الا یہ کہ ورثاء زائد کی اجازت دیدیں، کیونکہ مرض الموت میں اس کے مال کے ساتھ ورثاء کا حق متعلق ہو جاتا ہے، اس لئے تہائی مال سے زائد میں ورثاء سے اجازت لینے کی ضرورت ہے، البتہ تہائی مال میں اس کو تصرف کا حق حاصل ہے۔

"لقوله عليه السلام: إن الله تصدق عليكم في آخر أعماركم بثلث أموالكم، زيادة لكم في أعمالكم".

(أخرجه ابن ماجه رقم: ٢٧١٤، في كتاب الصلح)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری آخری عمر میں تمہارے لئے تہائی مال کو صدقہ کیا ہے تاکہ تمہارے اعمال میں اضافہ ہو۔

اس کی وضاحت کے لئے ایک سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس صورت میں کہ ہندہ نے بحالت مرض الموت میں اپنا حصہ مکان محدودہ کہ پوری غیر منقسم حسب دستاویز وقف نامہ مصدقہ تحریر شدہ برائے عبداللہ مسجد محلہ وقف کیا اور اپنی حیات میں اس پر متولیات قابض رہی، مکان مذکور میں کرایہ دار حسب دستور رہتے ہیں لہٰذا شرعاً واقفہ کی طرف سے بعد از وقف تسلیم اور قبضہ متولیات مکمل ہوا یا نہیں؟ نیز وقف نامہ مذکورہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بعد میرے اس کا متولی فلاں ہوگا، نہ میرے عزیز رہے گا اور متولی موصوف کو اختیار ہوگا وہ حصہ موقوفہ کو فروخت کر کے زرِ ثمن اس کا مسجد موصوفہ کی تعمیر طلب میں لگا دے چنانچہ بعد انتقال واقفہ کے متولی نے زرِ ثمن موقوفہ پر بحیثیت متولیانہ تحریر کرایہ نامہ، کرایہ دار سے حصہ رسدی کرالیا مگر چونکہ وہ موقوفہ نہایت قلیل ہے قابل انتفاع نہیں تقریباً تھوڑا گز عرض اور بارہ گز

طور پر تعمیر میں آتی ہے جو سوائے فروختگی اس سے کوئی حصولِ منفعت ممکن نہیں، جس کی رو سے متولی کو حسب شرائط واقف مشورہ واتفاق صاحبان اہل الرائے ریتھا ارکی فروخت کرکے زر ثمن اس کا تعمیر مسجد موصوف میں صرف کردینا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب: اگر یہ دکان مع مکان مذکورہ پوری ملکیت والی بندہ کے تمام متروکہ کا ثلث ہے یا ثلث سے کم ہے تو وقف صحیح و نافذ ہو گیا، اور اگر زائد از ثلث ہے تو ثلث میں وقف صحیح ہے اور زائد کا وقف بندہ کے وارثوں کی رضا پر موقوف ہے، اگر وہ جائز کریں تو جائز ہے، اور اگر راضی نہ ہوں تو زائد از ثلث میں وقف صحیح نہیں۔ اگر یہ دکان موقوفہ تجارت قلیل نفع والی منفعت ہے تو متولی مسجد کو چاہئے کہ اس کو فروخت کرکے اس کے ثمن سے کوئی دکان مسجد کے لئے چھوٹی یا بڑی تعمیر کردے یا کوئی زمین خریدے جس کا کرایہ مسجد میں آتا رہے یا مسجد میں تعمیر کی ضرورت ہو تو تعمیر میں لگا دے۔

قال في الدر في بيان شرائط الاستبدال: ما نصه وكون البدل عقاراً، وقال الشامي: وزاد العلامة قنالي زاده في رسالته شرطاً ثامناً وهو أن يكون البدل والمبدل من جنس واحد ثم قال: والظاهر عدم اشتراط اتحاد الجنس في الموقوفة للاستغلال لأن المنظور فيه كثرة الريع وقلة المرمة والمؤنة فلو استبدل الحانوت بأرض تزرع وتحصل منها غلة قدر أجرة الحانوت كان أحسن لأن الأرض أدوم وأبقى وأغنى عن كلفة الترميم والتعمير اهـ. (٣/٦٠١ شامي)

قلت: دل قوله: لأن المنظور فيه كثرة الريع على عدم جواز الاستبدال بما لا ريع فيه أصلاً، والله أعلم.

وفي الخلاصة: ولو شرط في الوقف أن يبيعه ويجعل ثمنه في وقف أفضل منه له أن يبيعه، ولا يبيعه الا الامام الحاكم لكن اذا رآه الحاكم اذن به اهـ. (٤/٤١٤)

قلت: ظهر منه جواز صرف ثمن الدار في عمارة المسجد لاجل اجازة الواقف وإذنه في ذلك ولعل منعهم الحاكم عن ذلك لو فاته من التهم فقط والله أعلم.

في باب الوقف على الاولاد و اولاد الاولاد ولو ذكر البطون الثلاثة ثم قال : على الاقرب فالاقرب و قال : على ولدي و ولدي ثم على ولدي ولدي ثم و ثم او قال : بطنا بعد بطن يبدأ بما بدأ به الواقف و لا يكون للبطن الاسفل شئ ما بقى من الاعلى احد اهـ . ( ۱/۴۳۷ )

قال : فاقول : بطنا بعد بطن في معنى قوله بطناً بعد بطن فلا يستحق الاسفل شيئاً ما بقي من الاعلى احد ويصلح للامامة وليس للاناث في هذا الوقف شئ لانهن بمعزل عن الامامة .

وفيه ايضاً : لا يستحق الا من باشر العمل اهـ .

وفي الاشباه : وقد افتى كثير من الفقهاء في زماننا فاستحبوا معاليم الوظائف من غير مباشرة اهـ . ( ۲۰۵/۱ )

قلت : ومباشرة الامامة ليس باعتبار المباشر بل تتوقف على نصب اهل المحلة اياه لها . ( ماخوذ از امداد الاحكام : ۳/۹۹ )

## مال حرام سے مسجد تعمیر کرنے کا حکم:

حرام مال مسجد پر صرف کرنے کی مختلف صورتیں ہیں اور ان کا حکم بھی مختلف ہے۔

(۱) حرام مال سے مسجد کی زمین نہ خریدی گئی ہو بلکہ صرف دیواروں پر خرچ کیا گیا ہو تو اس صورت میں بعض اکابر نے تحریر فرمایا ہے۔

” حرام مال سے مسجد کی زمین کا استعمال نہیں پایا جاتا اس لئے اس میں نماز درست ہے مگر حرام مال مسجد پر صرف کرنے کا گناہ ہوگا لہٰذا مال حرام سے تعمیر کردہ دیواریں گرا کر حلال مال سے دوبارہ تعمیر کرنا ضروری ہے۔“

قال في الشامية : ( قوله لو بماله الحلال ) قال تاج الشريعة اما لو انفق في ذلك مالا خبيثاً او مالا سببه الخبيث و الطيب فيكره لان الله تعالى لايقبل الا الطيب فيكره تلويث بيته بما لا يقبله اهـ شرنبلالية .

( رد المحتار جـ ۱ )

قول عدم استعمال خلاف ظاہر ہے لہٰذا اس صورت کا حکم بھی صورت ثانیہ کی طرح معلوم

ہوتا ہے۔

(۲) اگر حرام مال فرش پر لگایا گیا تو نماز پڑھنے سے حرام کا استعمال ہوگا لہٰذا اس میں نماز مکروہ تحریمی ہے، اس کا تدارک یوں ہو سکتا ہے کہ حرام مال سے تیار کردہ فرش کو ہٹا کر طیب مال سے فرش لگایا جائے۔

(۳) اگر حرام مال سے زمین خرید کر اس پر مسجد بنائی گئی تو اس میں بھی استعمال حرام کی وجہ سے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور اس کا تدارک بھی ممکن نہیں، مگر چونکہ اس کا وقف صحیح ہو چکا ہے اس لئے بیع اول کا استرداد کر کے دوبارہ مال طیب سے اشترا نہیں کیا جا سکتا۔

یہ مسجد اگرچہ غیر مقبول ہے لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم "لا یقبل الا طیبا" مگر اس کے باوجود شرعی مسجد ہے اس میں کوئی شبہ نہیں، لہٰذا اس کی بے حرمتی جائز نہیں۔

مسجد کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ موقوف للصلوٰۃ ہو اور صحت وقف کے لئے زمین کا ملک واقف ہونا شرط، یہ شرائط اس مسجد میں موجود ہیں۔ کشاف اور مدارک کے حوالہ سے "قیل: کل مسجد بنی مباھاۃ او ریاء او سمعۃ او لغرض سوی ابتغاء وجہ اللہ او بمال غیر طیب فہو لاحق بمسجد الضرار" سے شبہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ

اولاً یہ قول "قیل" سے منقول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

ثانیاً اسے غیر مقبول ہونے پر محمول کرنا واجب ہے، یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ یہ مسجد ہی نہیں، اس لئے کہ مسجدیت کے شرائط موجود ہیں۔

غرضیکہ اس مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس کی بے حرمتی بھی جائز نہیں، اور نہ ہی اس کے تدارک کی کوئی صورت نظر آتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید اوراق مغصوبہ پر لکھا گیا ہو تو اس کا پڑھنا جائز نہیں "لانہ استعمال الحرام" اور اس کی بے حرمتی بھی جائز نہیں۔

لانہ قرآن، واللہ تعالیٰ اعلم (ماخوذ از احسن الفتاوی: ۶/۴۲۳)

## عیدگاہ پر پل تعمیر کرنے کا حکم:

ہمارے علاقہ میں عیدگاہ ہے جس میں عیدین کی نمازیں ہوتی ہیں۔ بچے کھیلتے بھی ہیں، یعنی عام دنوں میں کھیل کے میدان کے طور پر استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کا نام عیدگاہ گراؤنڈ ہے، اب حکومت دہلی سے پل ہو کر عیدگاہ سے گذرتا جاتا ہے جس سے عیدگاہ میدان کا آدھا حصہ

متاثر ہوگا، کیا شرعاً عیدگاہ پر یہ تعمیر کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ احسن الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ عیدگاہ پہ مدرسہ تعمیر کرنا بھی جائز نہیں اس بارے میں سوالات وجواب حاضر خدمت ہے۔

## عیدگاہ کی فاضل زمین پہ مدرسہ بنانا:

سوال:- یہاں مدرسہ عربیہ میں تعمیرات کی تنگی ہے اور عیدگاہ بہت وسیع ہے، اس کا کچھ حصہ کاشت کروایا جاتا ہے اور اس کی آمدنی عیدگاہ پر خرچ کی جاتی ہے، خیال ہے کہ اگر مدرسہ کی تعمیر کے لئے عیدگاہ کی فاضل اراضی کا استعمال کرنا شرعاً جائز ہو تو مدرسہ کافی وسیع پیمانے پر چلایا جاسکتا ہے، اس کے متعلق ایک استفتاء مرتب کر کے بعض حضرات علماء کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے بلاشک جواز کا حکم دیا، لیکن خیر المدارس کے دارالافتاء سے اور سہارنپور سے جو جواب آیا، انہوں نے شرط الواقف کنص الشارع کی عبارت پیش کر کے اس کو خلاف شرع قرار دے کر عدم جواز کا حکم دیا، پھر حضرت مولانا خیر محمد صاحب یہاں تشریف لائے، ان سے گفتگو ہوئی، وہ بھی چاہتے ہیں کہ اگر مسئلہ کی گنجائش نکل سکے تو ضرورت تو وقتی یہ ہے کہ مدرسہ منتقل کردیا جائے، اور انہوں نے فرمایا کہ آپ کی خدمت میں استفتاء بھیج دو، آپ مفصل جواب دیں گے، لہٰذا عرض ہے کہ آپ تفصیلی جواب عطا فرمائیں۔

### الجواب ومنہ الصدق والصواب

بندہ نے صورت مسئلہ میں بار بار غور کیا مگر سمجھ میں یہی آیا کہ عیدگاہ کی زمین میں مدرسہ بنانا جائز نہیں، ہر چند سوچنے کے باوجود مجوزین حضرات کے خیال کی بناء سمجھ میں نہیں آئی، اگر آپ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ کے فتاویٰ کے دلائل تحریر فرمادیتے تو ان پر بھی غور کرسکتا، بہرکیف مسئلہ کی نوعیت بالکل واضح ہے جس میں ذرا برابر شک وشبہ کی گنجائش نہیں، معہذا جو امور موجب خلجان ہوسکتے ہیں انشاء جواب میں ان کی تنقیح بھی کردی ہے۔

قال فی الشامیۃ: ان شرائط الواقف معتبرۃ اذا لم تخالف الشرع وھو مالک فلہ ان یجعل مالہ حیث شاء مالم یکن معصیۃ ولہ ان یخص صنفا من الفقراء ولو کان الوضع فی کلھم قربۃ.

(ردالمحتار: ۳/۴۹۴)

وقال في البحر: واتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه وإن اختلف أحدهما لا. (ردالمحتار: ۳/۵۱۵)

معلوم ہوا کہ شرط واقف کے خلاف کرنا اور جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں۔

خود واقف بھی اپنی شرط کے خلاف نہیں کر سکتا۔

قال في شرح التنوير: وقف ضيعة على الفقراء ثم قال لوليه أعط من غلتها فلانا كذا وفلانا كذا لم يصح لخروجه عن ملكه بالتسجيل. (ردالمحتار: ۳/۵۱۲)

ردالمحتار کے مندرجہ بالا جزئیے کے بعد "ان للواقف الرجوع في الشرط ولو مسجلا" (ردالمحتار: ۳/۵۱۸) کے جزئیے سے شبہ نہ کیا جائے کیونکہ اسی موقع پر علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وفيه كلام سيأتي" چنانچہ آگے چل کر ایک موقع پر نہایت بسط سے اس کی تحقیق فرمائی ہے جس سے چند اقتباسات تحریر کیے جاتے ہیں

لا يجوز أن يفعل إلا ما شرط وقت العقد.

وما كان من شرط معتبر في الوقف فليس للواقف تغييره ولا تخصيصه بعد تقرره ولا سيما بعد الحكم الخ

(ردالمحتار: ۳/۵۵۷)

غرضیکہ خود واقف بھی جہت وقف کو تبدیل نہیں کر سکتا۔

اسی طرح حاکم بھی بیت المال کے وقف میں تبدیل جہت کا اختیار نہیں رکھتا۔

قال في شرح التنوير: إن السلطان يجوز له مخالفة الشرط (أي إن قرى) وإن غاير شرط الواقف لأن أصلها لبيت المال.

وفي الشامية قلت: والمراد من عدم مراعاة شرطها أن للإمام أو نائبه أن يزيد فيها وينقص ونحو ذلك وليس المراد أنه يصرفها عن

الجهة القسمة الخ . (رد المحتار: ٤٧٦/٣)

حاصل یہ کہ جملہ کتب معتبرہ میں وضاحت ہے کہ شرط واقف اور جہت وقف کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، اگر موقوف علیہ سے استغناء ہو چکا ہو تو بھی وقف کی آمدن موقوف علیہ کے مماثل اقرب پر صرف کی جائے گی، اس حالت میں بھی جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں۔

قال في التنوير ومثله حشيش المسجد وحصيره مع الاستغناء عنهما والرباط والبئر إذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر (والحوض شرح) إلى أقرب مسجد ورباط وبئر (أو حوض . شرح) إليه

وقال في الشامية (قوله إلى أقرب مسجد أو رباط الخ) لف ونشر مرتب وظاهره أنه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب إلى حوض وعكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها

(ردالمحتار: ٥١٣/٢)

مذکورہ جزئیہ اگرچہ مصرف اول کے خراب ہو جانے سے متعلق ہیں مگر مصرف اول سے اوقاف کی آمدن اگر بہت زیادہ ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ استغناء دونوں صورتوں کو جامع ہے۔

شرح التنویر مع الشامیہ صفحہ ۴۱۵ میں یہ جزئیہ ہے:

ويبدأ من غلته بعمارته ثم ما هو أقرب لعمارته كإمام مسجد ومدرس مدرسة يعطون بقدر كفايتهم ثم السراج والبساط كذلك إلى آخر المصالح وإن لم يشترطه الواقف لثبوته اقتضاء

اس سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ وقف مسجد سے مدرس کو دینا جائز ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ وقف مسجد سے امام کو اور وقف مدرسہ سے مدرس کو دینا جائز ہے، اس لئے مندرجہ ذیل جزئیہ میں تصریح ہے کہ مسجد پر وقف کرتے وقت اگر مدرس کی شرط فی الوقف ہو تو وہ بھی مصارف لازمہ سے نہیں۔

قال في شرح التنوير وإنما يكون المدرس من الشعائر لو مدرس

بنانا ہوا اور نہ خراب کرنا درست نہیں۔ (ابن شاکی عفااللہ عنہ)

## مسجد کی زمین میں امام کا مکان بنانا:

مسجد کی تعمیر شروع کرنے سے پہلے مسجد کی چھت پر امام صاحب کے لئے مکان بنانے کی نیت کر لی جائے تو مکان بنانا جائز ہے لیکن اگر اس وقت ارادہ نہیں تھا مسجد بن جانے کے بعد ارادہ ہوا اب چھت پر یا بنی ہوئی مسجد کے کسی حصہ پر امام کے لئے گھر بنانا جائز نہیں۔ کیوں کہ جو زمین ایک دفعہ مسجد میں داخل ہو گئی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی کسی بھی ضرورت کے لئے اسے مسجد سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

قال في شرح التنوير ولو خرب ما حوله استغني عنه يبقى مسجدا عند الامام والثاني ابدا الى قيام الساعة وبه يفتى.

وفي الشامية (قوله ولو خرب ما حوله الخ) اي ولو مع بقائه عامرا وكذا لو خرب وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه لبناء مسجد آخر. (ردالمحتار: ۳/۵۴۳)

## منہدم مسجد کے سامان کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین و شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک مسجد خام بنوایا تھا مگر فی الحال منہدم ہونے لگی تو زید نے اس مقام پر مسجد خام توڑ کر مسجد پختہ کی بنیاد ڈالی مسجد پختہ تعمیر کرنا چاہتا ہے اور یہ سامان پختہ مسجد میں لگنے کے قابل نہیں ہے جیسے لکڑی، کھپڑا وغیرہ۔ اب سامان مسجد خام فروخت کر کے مسجد پختہ میں لگانا درست ہے یا نہیں؟ یا بانی مسجد خود سے قیمت زائد دے کر لے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہ فروخت کیا گیا تو سامان مسجد خام بیکار ضائع و ہلاک ہو جائے گا۔

الجواب: اگر دوسری مسجد پختہ اسی جگہ بنائی جا رہی ہے جہاں مسجد خام واقع تھی تو اس صورت میں مسجد خام کا قابل استعمال اسباب تو مسجد پختہ کی مرمت میں صرف کرنا جائز ہے اور اگر پختہ مسجد اس مقام پر نہیں بنائی گئی تو مسجد خام کا اسباب بعینہ یا بعد فروخت کر کے اس کی قیمت کا پختہ مسجد میں لگانا درست نہیں بلکہ مسجد خام کو درست کرنا لازم ہے۔

قال العلامة عبد الحي في فتاواه في مجموعة الفتاوى ولا يجوز

ان يهدم المسجد ليبنيه احكم الا اذا خاف ان ينهدم فيجوز لاهل هذه المحلة لا لغيرهم والا بد من مال انفسهم لا من مال الوقف الا بامر القاضي اهـ. (۱/۲۰۲)

وفيه ايضاً: در بحر الرائق است: قال محمد: اذا خرب المسجد وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه فانه يعود الى ملك الواقف وقال ابو يوسفؒ: هو مسجد ابداً الى قيام الساعة لا يعود ميراثاً ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيها اولا وعليه الفتوىٰ كذا في الحاوي القدسي اهـ ونقل العلامة عبد الحيؒ عن "سعادة المساجد لعمارة المساجد" للشرنبلالي ما نصه واذا علمت هذا فما في الدرر وفتاوى قاضي خان من جواز نقل المسجد اذا خرب خلاف ما عليه الفتوى كما هو المذكور في الحاوي وخلاف التصحيح المذكور في خزانة المفتين وقد مشى الشيخ الامام محمد بن سراج الدين الحانوتي على القول المفتى به من عدم نقل بناء المسجد اهـ (۱/۲۳۰) وفي المجتبى: واكثر المشائخ على قول ابي يوسفؒ ورجح في فتح القدير قول ابي يوسفؒ اهـ. فتاوى مذكور (۴/۴۲۹)

وفي الخلاصة: لو علق قنديلاً او بسط حصيراً او بواري في المسجد ثم خرب المسجد واستغنى عنه عادت هذه الاشياء الى ملك صاحبه وهو الصحيح من مذهب ابي يوسفؒ انه لا تعود الى ملك متخذها بل تحول الى مسجد آخر او يبيعها قيم المسجد لاجل المسجد اهـ. (۴/۴۲۴)

قلت: وهذا يؤذن بالفرق بين بناء المسجد حيث لا يحول وبين القناديل والحصير حيث يجوز تحويلها عند ابي يوسفؒ ايضاً.

(ماخوذ از امداد الاحکام: ۳/۱۷۳)

## بوقت ضرورت اوقاف فروخت کرنے کا حکم:

عام حالات میں تو وقف کو فروخت کرنا یا کسی اور کو ہبہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح اسکو بدلنا بھی جائز نہیں، اگر موقوفہ زمین خراب ہوجائے بنجر بن جائے اس سے استفادہ کرنا اور موقوف علیہ کو فائدہ پہنچانا ممکن نہ ہو تو اس کو بیچ کر کسی نفع بخش زمین کو خریدنا جائز ہے۔

چنانچہ امداد الاحکام ۳/۵۱۰ میں ایک سوال کے جواب میں مذکور ہے اسکی صورت میں مسجد اول کا سامان منتقل کر کے دوسری مسجد میں لگا دینا جائز ہے، اور زمین کا مبادلہ بھی جائز ہے۔

وهذا عند ابی حنيفة ومحمد رحمهما الله واما عند ابی يوسف رحمه الله فلا

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

**سوال**: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک مکان کا چہارم حصہ متعلق مسجد وقف ہے اور بھی دیگر مکانات اس مسجد کے متعلق وقف ہیں جو مرمت طلب ہیں اگر چہارم موقوفہ فروخت کرکے متولی مسجد اس کی قیمت سے بقیہ مکانات متعلقہ مسجد کی مرمت کر دے جس سے آئندہ مسجد کا نفع زیادہ ہونے کی امید ہے تو شرعا اس میں کوئی ممانعت یا حرج تو نہیں ہے مفصل بحوالہ شرع شریف جو حکم ہو اس سے اطلاع فرمائی جائے۔ بینوا توجروا۔

**الجواب**: اگر اس چہارم حصہ کی آمدنی معقول نہ ہو یا یہ اندیشہ ہو کہ کسی وقت زیادہ حصہ والے مسجد کے چہارم حصہ کو شاید دبالیں گے تو اس صورت میں اس کو فروخت کرکے بقیہ مکانات عالیہ شرکت الغیر کی مرمت میں اس رقم کا لگا دینا جائز ہے۔

وفی فتاوی النسفی: بیع عقار المسجد لمصلحة المسجد لایجوز وان کان بامر القاضی وان کان خرابا واما بیع النقض فیصح ونقل عن شمس الائمة الحلوانی انه یجوز للقاضی والمتولی ان یبیعه ویشتری مکانه آخر ان لم ینقطع ولکن یؤخذ بثمنه ما هو خیر منه للمسجد لا یباع ای غنه وقد روی عن محمد اذا ضعفت الارض الموقوفة عن الاستغلال والقیم یجد بثمنها ارضا آخر هی اکثر ریعا کان له ان یبیعها ویشتری بثمنها ما هو اکثر ریعا وفی الفتاوی عیه

"اتخذوا على ابوابها المطاهر وجمروها في الجمع."

(ابن ماجہ : ص ۵۵)

یعنی مسجدوں کے دروازے کے پاس طہارت خانہ بناؤ اور جمعہ کے دن مسجدوں میں خوشبو کی دھونی دو۔

اور سلف صالحین کی بھی یہی سنت تھی کہ مساجد میں خوشبو لگاتے اور دھونی دیتے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے: کہ انہوں نے حکم جاری فرمایا تھا کہ مدینہ کی مسجد میں ہر جمعہ کو دوپہر کے وقت دھونی دی جائے۔ (زاد المعاد : ۱/۴-۱)

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ خود ہر جمعہ کے دن مسجد میں دھونی دیتے تھے۔

افسوس کہ آج یہ سنت بالکل چھوٹ گئی، لوگ مساجد کے اندر طرح طرح کے مکروہ تکلفات تو کرتے ہیں مگر اس سنت کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے آج یہ سنت بالکل مرچکی ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اس سنت کو پھر سے زندہ کریں چاہے عطر استعمال کریں، چاہے عود کی دھونی دیں، اگر بتی بھی جلا سکتے ہیں، البتہ اس کا اہتمام ضروری ہے کہ باہر جلا کر اندر لایا جائے تاکہ ماچس کی گندھک کی بو سے مسجد محفوظ رہے۔

## مسجد میں بدبودار چیز داخل کرنے کی ممانعت:

کسی قسم کی کوئی بدبودار چیز مثلاً لہسن، پیاز اور مولی وغیرہ کو مسجد میں لانا یا ان کو کھا کر فوراً مسجد میں آنا ناجائز ہے، جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"من اكل من هذه الشجرة المنتنة فلا يقربن مسجدنا فان الملائكة تتاذى مما يتاذى منه الانس". (بخاری ومسلم)

یعنی "جو شخص بدبودار درخت (یعنی پیاز وغیرہ) میں سے کھائے وہ ہماری مسجد کے قریب بھی نہ آئے اس لئے کہ فرشتوں کو بھی ان تمام چیزوں سے ایذا پہنچتی ہے جن سے انسانوں کو ایذا ہوتی ہے"۔

مراد یہ ہے کہ جب تک اس کی بو منہ سے نہ جائے اس وقت تک مسجد میں داخل نہ ہو اور یہی حکم ہے ہر بدبودار چیز کا جیسے حقہ، سگریٹ، نسوار، بیڑی، اور لہسن وغیرہ جیسا کہ فقہ کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے، "اور طریقہ محمدیہ" میں مولی کو بھی اسی حکم میں داخل کیا ہے۔

([illegible])

آج کل بہت سے لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ بعض حضرات پیچھے پیچھے مسجد میں آتے ہیں پھر کسی طرح اگلی صفوں میں شریک ہو جاتے ہیں جس سے پہلے سے بیٹھے ہوئے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے اور فرشتوں کو بھی ایذا پہنچتی ہے، اسی طرح بہت سے لوگ ایسی چیزیں کھا کر مسجد میں آتے ہیں جن کے منہ میں بدبو وغیرہ کی بو ہوتی ہے انہی چیزوں میں نماز میں شریک ہو جاتے ہیں جس سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے لہذا اس سے بچنا بہت ہی ضروری ہے۔

## سگریٹ اور نسوار جیب میں رکھنا:

جیسا کہ بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت کی تفصیل اوپر معلوم ہو چکی ہے سگریٹ نسوار وغیرہ حالت نماز میں جیب میں رکھنا بھی جائز نہیں ہے، جبکہ بو پھیل جانے کا اندیشہ ہو، اس لئے ان چیزوں کو مسجد سے باہر ہی کہیں رکھ کر مسجد میں داخل ہونا چاہئے۔

## مسجد میں چٹائی کی ٹوپی رکھنا:

آج کل بعض مساجد میں چٹائی، پلاسٹک کی ٹوپی رکھنے کا دستور ہے جب کہ ایسی ٹوپیاں مسجد میں رکھنا احترام مسجد کے خلاف ہے بالخصوص جب کہ ان کے تنکے نکل کر مسجد میں بکھرتے ہیں اور ان پر میل کی تہہ نظر آتی ہے اور پسینے اور تیل کی بو آتی ہے کیا کوئی شخص ایسی ٹوپیوں کو اپنے مکان کی زینت بنانے کو تیار ہے؟ اگر نہیں تو خدا کے گھر کے لئے اس کو کیوں کر جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

یہ بات بھی تو سوچنے کی ہے کہ چٹائی یا پلاسٹک کی ٹوپی پہن کر آپ کسی کی شادی بیاہ کی مجلس یا کسی افسر کے سامنے نہیں جا سکتے، مسجد اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا دربار ہے یہاں کیسے پہن کر آ سکتے ہیں؟ اس لئے چٹائی یا پلاسٹک کی ٹوپیاں مسجد میں رکھنا جائز نہیں اور ان کو پہن کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیوں کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جو لباس پہن کر انسان کسی مجلس میں جانے سے شرماتا ہے ایسے لباس میں نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے، اس پر دوام مکروہ تحریمی کے قریب ہے، اس لئے احتیاط لازم ہے۔

## مسجد میں قرآن کریم رکھنا:

تلاوت کی غرض سے مسجد میں وقف کرنا کار خیر ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن قرآن کریم کے احترام کا خاص لحاظ ہونا چاہئے عام طور پر مساجد میں دیکھا جاتا ہے کہ قرآن کریم بالکل بے

کرنا جائز ہو جائے گا۔

وفي المحيط: عن ... قال: ... المسجد ... ثم يزد على هذا عمارة بالعمرة وقفا على المسجد ... سلمها الى المتولي وليس للمتولي ان يصرف غلتها الى غير الدهن اهـ. (ماخوذ از ... الاحکام: ۳/۱۷۳، ۴/۴۲۴)

## مسجد میں قرآن کریم کی تعلیم دینا:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ بچوں کو قرآن شریف وغیرہ اجرت لیکر مسجد میں پڑھانا بالاتفاق ناجائز ہے اور بلا اجرت محض ثواب کے لئے بعض فقہاء نے اجازت دی ہے۔ (کذا فی الاشباہ) لیکن بعض فقہاء اس کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں کیونکہ بحکم حدیث بچوں کو مسجد میں داخل کرانا ہی ناجائز ہے۔

(کذا فی حاشیۃ الاشباہ من تفسیر ... آداب المساجد: ص ۱۱)

اگر مدرسہ میں جگہ کی تنگی ہو اور اہل مدرسہ دوسری جگہ کے انتظام کی کوشش میں ہوں تو سردست دوسری جگہ کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم خراب ہو رہی ہو ایسی مجبوری کی صورت میں فقہاء نے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے۔

(۱) نماز، ذکر، تلاوت قرآن وغیرہ عبادات میں خلل نہ ہو۔

(۲) مسجد کی طہارت و نظافت اور آداب و احترام کا پورا خیال رکھا جائے۔

(۳) کمسن ناسمجھ اور آداب مسجد سے ناواقف بچوں کو نہ لایا جائے۔

(احسن الفتاوی: ۶/۴۵۸، فتاوی رحیمیہ: ۹/۲۰۰)

## مسجد میں ذکر جہری کی مجلس:

اگر کوئی شخص مشائخ حضرات میں سے کسی سے بیعت ہو اور انہوں نے ذکر جہری کی تعلیم دی ہو تو تعلیم کے مطابق بتایا ہوا ذکر جہری کر سکتے ہیں لیکن مسجد میں ذکر جہری سے نمازیوں کو تشویش لاحق ہوتی ہو تو ایسی صورت میں مسجد میں بلند آواز سے ذکر کرنا جائز نہیں

(فتاوی رحیمیہ: ۱/۳۴۸)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں اس میں اقوال بہت مختلف ہیں فیصلہ یہ ہے

ہے، اور عقیدۃً اسے ضروری سمجھتے ہیں، جبکہ اس کا ثبوت نہ تو خلفاء راشدین سے ہے نہ جماعت صحابہؓ سے اور نہ تابعین و تبع تابعین اور نہ بزرگان و سلف صالحین سے اور بتلایا جاتا ہے کہ یہ اظہار محبت اور عقیدت کا ایک طریقہ ہے حالانکہ اظہار محبت و عقیدت تو اتباع اور اطاعت سے ہوتا ہے۔

كما قال الله تعالى: ﴿ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ﴾ (الآية) (سورة آل عمران: ۳۱)

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کردیں گے۔ ولنعم ما قيل

تعصي الرسول وانت تظهر حبه، هذا لعمري في الفعال بديع
لو كان حبك صادقا لاطعته، ان المحب لمن يحب مطيع

یعنی تم رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی بھی کرتے اور ان سے محبت کا اظہار بھی کرتے ہو، قسم خدا کی یہ بہت ہی عجیب بات ہے، اگر سچی محبت ہوتی تو ضرور ان کا اتباع کرتے کیوں کہ محب اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ طریقہ اظہار محبت و عقیدت کا نہیں ہے بلکہ ریا و نمود اور خواہش پرستی ہے کئی بدعتوں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے ناجائز اور قابل ترک ہے۔

## مسجد کی زمین میں میت کو دفن کرنا:

آج کل ایک رواج یہ ہو گیا ہے کہ مسجد کی موقوفہ زمین میں بانی مسجد یا امام یا کسی بزرگ کے لئے مقبرہ بنایا جاتا ہے، جبکہ متولی یا منتظمہ کمیٹی کو شرعاً یہ حق نہیں ہے کہ موقوفہ زمین میں کسی کے لئے قبر بنانے کی اجازت دے، وہ جگہ صرف مصالح مسجد کے لئے خاص ہوگی اس کے علاوہ کوئی اور کام کرنا جائز نہیں ہے۔

صرح به عامة كتب الفقه، من الشامية والعالمگيرية.

(ماخوذ از امداد المفتیین: ص ۷۸۸)

## مسجد کی چھت پر جماعت کرانا:

مسجد کی چھت پر جماعت کرانا مکروہ ہے خواہ گرمی کی وجہ سے ہو یا کسی اور عذر سے البتہ مسجد اگر تنگ ہو تو زائد نمازی چھت پر جا سکتے ہیں۔

قال في الهداية: الصعود على سطح كل مسجد مكروه ولهذا

اذا اشتد الحر یکره ان یصلوا بالجماعة فوقه الا اذا ضاق المسجد فحینئذ لا یکره الصعود علی سطحه للضرورة کذا فی الغرائب ۔

(عالمگیریہ: ۵/۳۲۲، احسن الفتاوی: ۶/۴۶۲)

## مسجد میں چارپائی بچھانا:

بعض فقہا غیر مسافر ومعتکف کے لئے مسجد میں سونا مکروہ ہے بجانب ضرورت شدیدیہ تدبیر اختیار کرسکتا ہے کہ پہلے بنیت اعتکاف داخل ہو کر کچھ عبادت کرے اس کے بعد سوئے ۔

دراصل ادب یا بے ادبی کا مدار عرف پر ہے ہمارے عرف میں مسجد میں چارپائی بچھانا معیوب سمجھا جاتا ہے نیز اس سے عوام کے قلوب سے مسجد کی وقعت نکل جائے گی وہ چارپائی پر قیاس کرکے دوسرے ناجائز امور بھی مسجد میں شروع کردیں گے ۔لہٰذا مسجد میں چارپائی بچھانا جائز نہیں، جیسے پہلے جوتے پہن کر مسجد میں آنا اور نماز پڑھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا مگر ہمارے عرف میں اسے مسجد کی بے ادبی سمجھا جاتا ہے اگر کوئی پاک جوتا بھی پہن کر مسجد میں آجائے تو عوام اس پر ہنگامہ برپا کردیں گے اس لئے جوتا پہن کر مسجد میں آنا مکروہ ہے ۔(ماخوذ از احسن الفتاوی)

## مسجد میں گمشدہ چیز کی تلاش:

گمشدہ چیز کی تلاش مسجد میں جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ مسجد کے احترام کے خلاف ہے کیوں کہ اس میں شور اور ہنگامہ ناگزیر ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"من سمع رجلاً ینشد ضالة فی المسجد فلیقل لاردھا اللہ علیک فان المساجد لم تبن لھذا."

جو کسی شخص کو سنے کہ وہ مسجد میں گمشدہ چیز کی تلاش کرتا ہے تو چاہئے کہ کہے اللہ تعالیٰ اس کو تم پر نہ لوٹائے کیوں کہ مسجد اس کام کے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔

(مسلم باب النھی عن نشد الضالة: ۱/۲۱۰)

اس حدیث میں صرف گمشدہ چیز کی تلاش سے روکا ہی نہیں گیا ہے بلکہ اس میں اس پر زجر و توبیخ بھی موجود ہے اور ساتھ ہی اس کی علت بھی بیان کردی گئی ہے اس زمانہ میں خصوصیت سے اس حدیث پر عمل کرنا چاہئے اور اس حدیث کا مفہوم عام مسلمانوں کے ذہن نشین ہونا چاہئے اس وقت کوئی حرج سمجھ نہیں آتا جب چیز مسجد ہی میں گم ہوجائے تو آداب مسجد کا لحاظ کرتے ہوئے

ہے۔ (امداد الفتاویٰ ۲/ ۲۹۱)

## مسجد میں ہوا خارج کرنا:

مسجد میں ہوا خارج کرنا ناجائز ہے کیونکہ فرشتوں کو بھی ان چیزوں سے اذیت ہوتی ہے جس سے انسانوں کو اذیت ہوتی ہے (اشباہ) چونکہ معتکف اس حکم سے مستثنیٰ نہیں ہے اس لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ ہوا خارج کرنے کے لئے باہر نکلنا چاہئے۔ (آداب المساجد)

حضرت محمود حسن صاحب فرماتے ہیں جو شخص کثرت ریاح کا مریض ہو اس کو تو بار بار مسجد سے نکلنا ہوگا یا کراہت کا ارتکاب کثرت سے کرنا ہوگا۔

لہٰذا احوط یہی ہے کہ ایسا شخص اعتکاف نہ کرے بلکہ اللہ پاک سے دعا کرتا رہے اس کو نیت و تمنا کا اجر ملے گا۔

واختلفوا في الذي به ريح في المسجد فبعضهم قالوا لا بأس وبعضهم قالوا لا يفسو ويخرج إذا احتاج إليه وهو الأصح كذا في التمرتاشي. (عالمگیریہ: ۵/ ۳۲۱)

## مسجد کے روپیہ کو تجارت میں لگانا:

مسجد کی آمدنی اگر ضروریات مسجد سے زائد ہو تو مسجد کے حق کے لئے اس کو تجارت میں لگانا جائز ہے۔ (امداد المفتیین، ص ۷۸۰)

## مسجد میں خرید و فروخت:

مسجد میں خرید و فروخت اور بعض معاملات نکاح کے علاوہ ناجائز ہیں البتہ معتکف کے لئے بقدر حاجت جائز ہے بشرطیکہ سامان فروخت مسجد میں داخل نہ کرے۔ (آداب المساجد)

## مسجد میں عقد نکاح مستحب ہے:

قال النبي صلى الله عليه وسلم: اعلنوا هذا النكاح واجعلوه في المساجد. (مشكوة بحواله ترمذي)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "تم نکاح کا اعلان کیا کرو اور نکاح کی مجلس مسجد کے اندر منعقد کیا کرو۔" (ترمذی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح مسجد کے اندر کرنا مستحب ہے اسی طرح جمعہ کے دن کرنا

بھی مستحب ہے کیوں کہ مسجد میں اور جمعہ کے دن نکاح کرنے سے برکت حاصل ہوتی ہے۔

(مظاہر حق جدید)

البتہ یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے کہ مسجد کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا جائے، شور شغب سے احتراز کیا جائے اور چھوٹے بچے جو آداب مساجد سے ناواقف ہیں ان کو مسجد میں نہ لایا جائے اسی طرح کوئی گناہ کا کام نہ کیا جائے خصوصاً بعض لوگ اس تصویر کشی کی کوشش کرتے ہیں جو عام حالات میں بھی گناہ کبیرہ ہے پھر مسجد جیسی مقدس جگہ میں یہ اس کی قباحت و شناعت اور بھی بڑھ جاتی ہے، اسی طرح ہار وغیرہ مسجد کے اندر نہ پہنایا جائے کیوں کہ اس سے بچے وغیرہ کے دوڑنے کی وجہ سے تلویث مسجد کا خطرہ ہے۔

## مسجد میں افطار کرنا:

آج کل جس طرح مساجد کے اندر افطار کرنے کا دستور ہے اس میں مسجد کی تلویث اور بے حرمتی ہوتی ہے لہٰذا یہ جائز نہیں۔ مسجد کی منتظمہ کمیٹی پر ضروری ہے کہ لوگوں کو افطار کے بعد انتظار کرنے کا حکم کرے کہ محلّہ کے نمازی گھروں میں اطمینان سے افطار کر کے مسجد میں پہنچیں۔ (احسن الفتاویٰ) ہاں البتہ مسافروں کے لئے مسجد سے باہر بقدر ضرورت انتظام کر سکتے ہیں کہ سہولت رہے۔

## مسجد کا مکان بینک یا کسی بھی حرام کام کرنے والے کو کرایہ پر دینا:

بینک یا کسی بھی خلاف شرع امور انجام دینے کو مسجد کا مکان کرایہ پر دینا تعاون علی الاثم کے مترادف ہے اور قرآن کریم میں تعاون علی الاثم کی ممانعت آئی ہے ارشاد خداوندی ہے:

﴿ولا تعاونوا على الاثم والعدوان﴾

گناہ اور زیادتی کے کاموں میں معاونت مت کرو، لہٰذا شرعاً ان کو مکان کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۶/ ۱۰۱)

## مسجد کی رقم کا سود:

اول تو مسجد کا روپیہ بینک میں جمع کرنا جبکہ حفاظت کا دوسرا ذریعہ موجود ہو خلاف احتیاط ہے اور اگر غلطی سے یا غفلت سے یا قانونی مجبوری کی وجہ سے رقم بینک میں رکھی ہوا اور اس پر سود ملا ہو تو وہ مسجد کے بیت الخلاء، غسل خانہ کی مرمت یا صفائی کی چیزوں میں خرچ کیا جائے اگر اس میں ضرورت نہ ہو تو غرباء کو دیا جائے، رفاہ عام کے کاموں میں بھی استعمال کر سکتے ہیں، مسجد یہ رقم

خرچ نہیں ہونے کی، یہ تقدس مسجد کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ بحوالہ کفایۃ المفتی)

## مسجد میں غیر مسلم کا چندہ لینا:

اگر غیر مسلم اپنے اعتقاد سے اسے قربت سمجھتا ہو تو اس کا چندہ لینے کی گنجائش ہے مگر اس زمانہ میں غیر مسلم کی رقم مسجد میں استعمال کرنے سے بچنا چاہئے غیر مسلم کا مسجد پر احسان ہو جائے گا اور کسی وقت ان کے مذہبی کاموں میں چندہ دینا اور شرکت کرنا پڑے گی لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

(فتاویٰ رحیمیہ بحوالہ امداد المفتیین)

## مسجد میں نماز جنازہ:

بلا عذر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ تحریمی ہے، خواہ جنازہ مسجد کے اندر ہو یا باہر البتہ نماز جنازہ کے لئے کوئی دوسری جگہ نہ ہو تو عذر کی وجہ سے مسجد میں جنازہ پڑھنے میں کراہت نہیں۔

(شامی، احسن الفتاویٰ: ۴/۱۸۲)

## مسجد میں جماعت ثانیہ:

بعض لوگ جماعت سے رہ جاتے ہیں پھر ان کو مسجد میں دوسری جماعت کرنے کا شوق ہوتا ہے حالانکہ جماعت ثانیہ جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے کہ: مسجد محلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ قوله ويكره اي تحريماً. (شامی)

پس اس میں شرکت کرنا درست نہیں اور مقتدی مستحق ثواب نہیں جماعت ثانیہ کی عادت موجب تقلیل جماعت اولیٰ ہے، یہی ایک وجہ فقہاء نے ممانعت جماعت ثانیہ کی تحریر فرمائی ہے اور فعل مکروہ میں شرکت واعانت ظاہر ہے کہ موجب ثواب نہیں ہو سکتی۔

(عزیز الفتاویٰ، ص ۱۹۰)

## مسجد میں چھوٹے بچوں کو لانا:

مسجد میں چھوٹے بچوں کو لانے کی شرعاً اجازت نہیں ہے اس سے مسجد کا ادب و احترام باقی نہیں رہے گا اور لانے والے کو بھی اطمینان قلب نہ رہے گا، نماز میں کھڑے ہوں گے مگر خشوع و خضوع نہ ہوگا، بچوں کی طرف دل لگا رہے گا، حضور ﷺ کا ارشاد ہے

"جنبوا مساجدكم صبيانكم ومجانينكم الخ"۔

یعنی اپنی مسجدوں کو بچوں اور پاگلوں سے بچاؤ۔ (ابن ماجہ : ص ۵۵)
اسی لئے فقہاء کرام رحمہم اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسجد میں بچوں کو داخل کرنا اگر اس سے مسجد کے نجس ہونے کا اندیشہ ہو تو حرام ہے ورنہ مکروہ ہے۔ (الاشباہ والنظائر : ص ۵۵۷)
ہاں البتہ اگر بچہ سمجھدار ہو نماز پڑھتا ہو، مسجد کے ادب و احترام کا پاس و لحاظ رکھتا ہو تو اس کو مسجد میں لانے میں کوئی حرج نہیں، غالبا اسی بناء پر سات سال کی قید حدیث میں موجود ہے یعنی سات سال سے کم عمر کے بچوں کو نہیں لانا چاہئے اس سے بڑی عمر کے بچوں کو آداب و احترام کی تعلیم دے کر لانا چاہئے، وہ نابالغ بچوں کی صف میں کھڑا ہو اگر صرف ایک ہی بچہ ہے تو وہ بالغوں کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے مکروہ نہیں ہے۔ (فتاوی رحیمیہ : ۱۲۱/۳)

## مسجد کی صفائی کا اہتمام:

مسجد کی صفائی ستھرائی کا اہتمام کرنا امت محمدیہ ﷺ کے لئے کس حد تک ضروری ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ بنفس نفیس مسجد کی صفائی فرماتے تھے، حضرت یعقوب بن زیدؓ سے روایت ہے:

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتبع غبار المسجد بجریدۃ۔" (مصنف ابن ابی شیبۃ : ۳۹۸/۱)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ مسجد کے گرد و غبار کو کھجور کی ٹہنی سے صاف کیا کرتے تھے۔
اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق منقول ہے کہ وہ ایک مرتبہ گھوڑے پر سوار ہو کر مسجد قباء تشریف لے گئے اس میں نماز پڑھی پھر فرمایا "اے یرفا (کسی شخص کا نام ہے) مجھے کھجور کی ایک ٹہنی لا کر دو، اس نے لا کر دی آپؓ نے ایک کپڑے سے اپنی کمر باندھی اور تمام مسجد میں جھاڑو دی۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ۳۹۸/۱)
اسی طرح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے اعمال کے ثواب سب میرے سامنے پیش کئے گئے یہاں تک کہ ایک ایسا تنکا کہ جس کو کسی شخص نے مسجد سے نکالدیا ہو اس کا ثواب بھی پیش کیا گیا اور میری امت کے سارے گناہ بھی پیش کئے گئے، پس میں نے کوئی گناہ اس سے بڑا نہیں دیکھا کہ آدمی قرآن مجید کی کوئی آیت یاد کر کے پھر بھول جائے۔ (مشکوۃ بحوالہ ابوداؤد۔ ترمذی)

# احکام الاکراہ

## مجبور شخص کے احکام:

الاکراہ لغۃ: الالزام و الاجبار، یقال: اکرہ فلان علی العمل کذا اذا

اجبرہ علیہ دون رضاہ۔

## جبر و اکراہ کی اصطلاحی تعریف:

کسی انسان کو قتل یا سخت اذیت یا مال تلف کرنے کی دھمکی دے کر کسی خلاف شرع یا خلاف طبع کام کرنے پر مجبور کرنا۔

الاکراہ: حمل الغیر علی ما یکرہہ بالوعید بالقتل او التھدید بالضرب الشدید او باتلاف المال او بالاذی الشدید، قال صلی اللہ علیہ وسلم: رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ ای ما اکرھوا علیہ من قول او فعل جبراً وقھراً دون اختیار۔

اخرجہ ابن ماجہ فی سننہ رقم: ۲۰۴۳، بلفظ ان اللہ تجاوز لی عن امتی: الخطأ والنسیان وما استکرھوا علیہ۔ (فقہ المعاملات)

## اکراہ کی دو قسمیں:

(۱) اکراہ غیر ملجی:

یعنی کسی کو ایسے قول یا فعل پر مجبور کیا جائے جس کے کرنے پر وہ دل سے راضی نہیں لیکن ایسا بے اختیار بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ غیر ملجی کہلاتا ہے۔ ایسے اکراہ سے کوئی کلمہ کفر کہنا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ اثرات مرتب ہوتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ میں مفصل مذکور ہے۔

(۲) اکراہ ملجی:

یعنی اکراہ کا وہ درجہ ہے کہ وہ مسلوب الاختیار کر دیا جائے کہ اگر اکراہ کرنے والوں کے کہنے پر عمل نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ ملجی کہلاتا ہے۔

ایسے اکراہ کی حالت میں کلمۂ کفر زبان سے کہہ دینا، بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے۔ اسی طرح دوسرے انسانوں کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی حرام فعل کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں۔

مگر دونوں قسموں میں شرط یہ ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس پر قادر بھی ہو اور جو شخص مبتلا ہے اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اس کی بات نہ مانوں گا تو جس چیز کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا۔ (تفسیر مظہری معارف القرآن ص ۴۰۷/ ج ۵)

قال في ملتقى الأبحر: وشرط الإكراه قدرة المكره -اسم فاعل- على ما هدد به، سلطانا كان أو لصا، وخوف المكره -اسم مفعول- وقوع ذلك، وكونه ممتنعا قبله عن فعل ما أكره عليه لحقه، أو لحق آخر، أو لحق الشرع، وكون المكره به متلفا نفسا أو عضوا أو موجبا غما يعدم الرضا.

(ملتقى الأبحر للإمام ابراهيم الحلبي: ۲/ ۱۷۸)

اکراہ سے حرام کے ارتکاب پر گناہ نہ ہونے کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

والأصل في هذا قول الله تبارك وتعالى في أعظم الذنوب، وهو الكفر: ﴿مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝﴾

(سورة النحل: الآيتان ۱۰۶-۱۰۷)

یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر جس شخص پر زبردستی کی جائے، بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو لیکن ہاں جو جی کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کو بڑی سزا ہوگی اور یہ اس سبب سے ہوگا کہ انہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں عزیز رکھا اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔

(بیان القرآن)

یہ آیت صحابہ کرام کے بارے میں نازل ہوئی جن کو مشرکین نے گرفتار کر لیا تھا، اور کہا تھا کہ وہ کفر اختیار کریں ورنہ قتل کر دیے جائیں گے۔

یہ گرفتار ہونے والے حضرات، حضرت عمار اور ان کے والدین یاسر اور سمیہ اور صہیب اور بلال اور خباب رضی اللہ عنہم تھے، جن میں سے حضرت یاسر اور ان کی زوجہ سمیہ نے کلمۂ کفر بولنے سے قطعی انکار کیا، حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا، اور حضرت سمیہ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ان کو مختلف سمتوں کی طرف دوڑا دیا گیا جس سے ان کے دو ٹکڑے الگ الگ ہو گئے اور وہ شہید ہو گئیں یہی وہ بزرگ ہیں جن کو اسلام کی خاطر سب سے پہلے شہادت نصیب ہوئی، اسی طرح خباب رضی اللہ عنہ نے کلمۂ کفر بولنے سے قطعی انکار کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ قتل کیے جانے کو قبول کیا، ان میں سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جان کے خوف سے زبانی کلمۂ کفر کا اقرار کر لیا مگر دل ان کا ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، جب دشمنوں سے رہائی پا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بڑے رنج و غم کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کیا، آنحضرت ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ جب تم یہ کلمہ بول رہے تھے تو تمہارے دل کا کیا حال تھا، انہوں نے عرض کیا کہ دل تو ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو مطمئن کیا کہ تم پر اس کا کوئی وبال نہیں، آپ ﷺ کے اس فیصلہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (قرطبی، مظہری)

وقال العلامة الصابوني حفظه الله:

ومن سبب نزول الآية الكريمة، يتضح لنا بجلاء حكم الإكراه الملجي، الذي تحدث عنه الفقهاء، والذي يبيح للمسلم فعل ما أكره عليه.

أ- روى الحافظ ابن كثير من سبب نزول هذه الآية أن "عمار بن ياسر" رضي الله عنه، أخذه المشركون فعذبوه، عذاباً شديداً، حتى قاربهم إلى ما أرادوه في بعض ما أرادوا، وأظهر الكفر على لسانه فشكا ذلك إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: كيف تجد قلبك؟ فقال يا رسول الله: أجده مطمئناً بالإيمان! فقال له عليه الصلاة والسلام: "إن عادوا

فعد" تفسير ابن كثير ٢/٥٨٩، أي إن عادوا إلى تعذيبك وإكراهك فعد إلى ما قلت لهم.

ب: وروى الحاكم والبيهقي أن "عمار بن ياسر" لما أكرهه المشركون على سب محمد صلى الله عليه وسلم رجع إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال له: ما وراءك يا عمار؟ قال: شر يا رسول الله، ما تركوني حتى نلت منك وذكرت آلهتهم بخير!!

قال: كيف تجد قلبك؟ قال: مطمئنًا بالإيمان. فقال له صلى الله عليه وسلم:

"فإن عادوا فعد" وفي ذلك أنزل الله تعالى: ﴿إلا من أكره وقلبه مطمئن بالإيمان﴾ الآية

(أخرجه الحاكم والبيهقي، وقال الحاكم: صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه وانظر نصب الراية: ٤/١٥٨)

## کفر پر اکراہ کے وقت ایمان پر ثابت قدم رہنا افضل ہے:

اگر کوئی مسلمان کسی کافر کی قید میں آجائے اور وہ کلمۂ کفر پر مجبور کرے اور بصورت دیگر قتل کی دھمکی دے تو شرعاً زبان سے کلمۂ کفر کہنے کی جو اجازت ہے یہ گنجائش اور رخصت ہے، اس وقت بھی عزیمت کا راستہ یہی ہے کہ زبان سے بھی کلمۂ کفر نہ کہے اور ایمان پر ثابت قدم رہے، اور کفریہ طاقت کے سامنے ڈٹ جائے اور جان دیدے، صحابۂ کرام کے بکثرت واقعات ہیں، جن میں انہوں نے ایمان پر ثابت قدمی دکھائی اور جان قربان کردی۔ چنانچہ ذیل میں صحابۂ کرام کے ایمان پر ثابت قدمی کے چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں جو بعد کے مسلمانوں کیلئے یقیناً مشعل راہ ہیں۔

١ـ ويدل على ذلك ما روي أن "مسيلمة الكذاب" الذي ادعى النبوة، وقع تحت يديه رجلان من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم في الأسر، فجيء بهما إليه، فقال لأحدهما: ما تقول في محمد؟ قال: هو رسول الله!!

قال: فما تقول في؟ قال: وأنت أيضاً!! فخلى سبيله!

العذاب ، من أجل دينه ، كما استشهدت سمية أم عمار بن ياسر ، قتلها أبو جهل عدو الله ، بحربة قطع بها أمعاءها ، لأنها أبت الكفر ، وثبتت على الإسلام ، فكانت أول شهيدة من نساء في الإسلام ، وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يمرّ على هؤلاء المعذبين من آل ياسر ، فيقول لهم : صبرا آل ياسر ، فإن موعدكم الجنة .

٣۔ يروي لنا الإمام البخاري في صحيحه ، ما أصاب المسلمين من شدائد ومحن ، فيقول بسنده عن خباب بن الأرت رضي الله عنه قال : شكونا إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم ، وهو متوسد بردة له في ظل الكعبة ، وقد لقينا من المشركين شدة فقلنا يا رسول الله : ألا تستنصر لنا !!ألا تدعو لنا!! .

فقال لهم صلى الله عليه وسلم : قد كان من قبلكم ، يؤخذ الرجل فيحفر له في الأرض ، يعني حفرة فيجعل فيها ، ثم يؤتى بالمنشار ، فيوضع على رأسه فيجعل نصفين ، أي ينشر حتى يقع على الأرض شقين ، ويمشط بأمشاط الحديد مادون لحمه وعظمه ، ما يصده ذلك عن دينه!! .

والله ليتمن الله هذا الأمر ، أي يظهر دين الإسلام ، حتى يسير الراكب من صنعاء إلى حضر موت ، لا يخاف إلا الله ، والذئب على غنمه ، ولكنكم تستعجلون . ( أخرجه البخاري رقم : ٣٦١٢ )

**(۳)**

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے سایہ میں چادر لپیٹے ہوئے تشریف فرما تھے ہمیں مشرکین کی طرف سے سخت اذیت پہنچ رہی تھی ، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) کیا آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب نہیں فرماتے؟ کیا آپ ہمارے حق میں دعا نہیں فرماتے؟

آپ ﷺ نے تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ گذشتہ انبیا کی امتوں کو طرح طرح کی تکالیف

دی گئیں تھیں ان پر سخت آزمائشیں آئی تھیں حتیٰ کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ گڑھا کھود کر اس میں ڈال دیا جاتا پھر آری سے ان کے سر کو چیر کر دو ٹکڑے کر کے زمین پر پھینک دیتے اور بعض لوگوں کے زندہ جسموں پر لوہے کی کنگھی کی جاتی جس سے تمام گوشت ادھڑ جاتا جسم پر صرف ہڈی رہ جاتی، لیکن یہ تمام تکالیف و مشقتیں ان کو دین حق سے نہ پھیر سکیں۔

اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ دین اسلام کو ضرور غلبہ عطا فرمائیں گے، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا، دین کی برکت سے ایسا امن و سکون قائم ہوگا کہ ایک شخص صنعاء یمن سے حضر موت تک تنہا سفر کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا جیسے بھیڑیا سے بکریوں پر نقصان کا خوف نہ ہو، لیکن تم مدد اور غلبۂ اسلام کی طلب میں جلدی کیا تے ہو۔ (بخاری)

4- وقصة "خبيب بن عدي" رضي الله عنه، رمز للبطولة والفداء، والشهادة في سبيل الله، فقد غدر المشركون ببعض الصحابة، الذين أرسلهم رسول الله صلى الله عليه وسلم لتعليم القرآن والدعوة الى الله، فوقع "خبيب بن عدي" في شباكهم، فنزلوا به الى مكة وباعوه لكفار قريش، فعذبوه عذاباً شديداً ليجبروه على الكفر، ويردوه عن الاسلام، وطلبوا منه أن يسب محمداً صلى الله عليه وسلم ويذكر آلهتهم بخير، فلم يسب الا آلهتهم، ولم يذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم الا بخير.

ولما يئسوا من كفره، عزموا على قتله، اجتمع حوله الأشرار الفجار، ليروا مصرعه، ولما أرادوا قتله طلب منهم أن يصلي ركعتين، فأذنوا له، فأوجز في صلاته، وقال: والله لولا أن يظنوا بي الجزع، أي الخوف من الموت، لأطلت في الصلاة، ثم طلب منهم أن يلقوه على وجهه ليموت وهو ساجد، فأبوا عليه ذلك، فرفع يديه نحو السماء ثم قال: اللهم اني لا أرى الا وجه عدو، فأقرأ رسول الله مني السلام، ثم دعا على المشركين فقال: اللهم أحصهم عدداً، واقتلهم بدداً، ولا تبق منهم أحداً، ثم أنشد يقول:

ولست أبالي حين أقتل مسلما
على أي جنب كان في الله مصرعي
ولســت بمبــد للعدو تخشعا
ولا جزعا إني إلى الله مرجعي

فلما قتلوه وصلبوه تحول وجهه نحو القبلة، وأخبر عنه الرسول صلى الله عليه وسلم فقال:
"هو رفيقي في الجنة فهما ذلك عني". فثبات على الإيمان أفضل من الأخذ بالرخصة."

(روى القصة الإمام أحمد وأبو داود والنسائي، انظر نصب الراية ۴ : ۴۸۴)

(۳)

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے تعلیم قرآن اور دین اسلام کی دعوت کے لئے مدینہ منورہ سے وفد کی شکل میں روانہ فرمایا تھا، لیکن اتفاق سے کفار کی غداری اور دھوکہ کی وجہ سے ان کے قید میں آگئے اور ان کو گرفتار کرکے مکہ مکرمہ لے جایا گیا، اور قریش مکہ کے ہاتھ فروخت کردیا، قریش نے آپ کو سخت تکلیفیں پہنچائیں اور بہت ڈرایا دھمکایا تاکہ وہ دین اسلام سے پھر جائیں اور کفر کی طرف لوٹ آئیں، اور ان سے مطالبہ کرتے رہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سب و شتم کریں اور کفار کے معبودان باطلہ کی تعریف کریں، لیکن ہر دفعہ ان معبودان باطلہ کی مذمت اور رسول اللہ ﷺ کی تعریف ہی فرماتے رہیں، جب کفار مکہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے کفر و ارتداد سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے قتل کا ارادہ کرلیا، اور ان کے قتل گاہ کے گرد کفار کا مجمع جمع ہوگیا تاکہ قتل کا نظارہ کریں، اس وقت حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کفار سے اجازت طلب کی تاکہ وہ دو رکعت نماز پڑھ لیں، چنانچہ اجازت مل گئی اور مختصر دو رکعت نماز پڑھی، پھر ارشاد فرمایا: خدا اگر مجھے اس طعنہ کا خوف نہ ہوتا کہ یہ مسلمان موت سے گھبرا گیا تو میں طویل نماز پڑھتا، پھر کفار سے درخواست کی کہ مجھے اوندھے منہ لٹایا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کی حالت میں موت آئے لیکن کفار نے اس بات کو قبول نہیں کیا، تو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے آسمان کی طرف

ہاتھ اٹھایا اور دعا کی: اے اللہ یہاں تو دشمن کے چہروں کے علاوہ کوئی چہرہ نظر نہیں آ رہا ہے، پھر مشرکین کے خلاف بددعا کی:

اللهم احصهم عددا، واجعلهم بددا، ولا تبق منهم احدا

یعنی اے اللہ ان کفار کو گن گن کر قتل کر دے، اور ان کو منتشر کر دے، اور ان میں سے کسی کو روئے زمین پر باقی نہ چھوڑ، پھر مذکورہ بالا اشعار کہے جن کا مطلب یہ ہے:

جب ایمان کی حالت میں موت نصیب ہو رہی ہو تو مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ اللہ کی خاطر جان دینے کے بعد میری لاش کس سمت میں گری ہوگی، میں کفار کے سامنے جزع فزع کا اظہار نہیں کروں گا، میرا مرنا تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہے۔

قصة عبد الله بن حذافة السهمي

ثم وقد ذكر الحافظ ابن كثير في تفسيره عند هذه المقدمة الرائعة، قصة "عبد الله بن حذافة" أحد صحابة النبي صلى الله عليه وسلم، أنه كان في أحد المعارك مع الروم، فوقع أسيرا مع بعض المسلمين في أيدي الروم، وأخبر ملك الروم بأن بين الأسرى رجلا من الصحابة، فأمر به فأحضر، فعرض عليه أن يتنصر، وقال له: أزوجك ابنتي، وأقاسمك نصف ملكي، إن دخلت في النصرانية وتركت دين محمد!!

فقال له عبد الله: والله لو أعطيتني كل ما تملك، وكل ما يملكه العرب، وكل ما في الدنيا، على أن أترك دين محمد طرفة عين، ما فعلت!!

فقال له ملك الروم: إذا أقتلك!! فقال: افعل ما بدا لك وما شئت!!

فأمر به الملك أن يصلب على عمود، وأمر الرماة أن يرموه بالسهام في غير مقتل، وهو يعرض عليه النصرانية فيأبى!!

ثم أمر بإنزاله، وأمر الجند أن يأتوا له بقدر كبيرة، فأحمي عليها حتى صارت حمراء لاهبة من شدة الحرارة، وأمرهم أن يأتوا بأسير

بالرخصة كما ذكر العلماء.

(انظر تفسير الحافظ ابن كثير: [illegible] وقد روى هذه القصة عن الحافظ ابن عساكر)

## دوسرے مسلمان کے مال تلف کرنے پر مجبور کرنا:

جب کسی مسلمان کو قتل وغیرہ کی دھمکی کے ذریعہ مجبور کیا جائے کہ دوسرے مسلمان کا مال تلف کرے تو شرعاً حکم یہ ہے کہ مال تلف کرکے اپنی جان بچائے بعد میں "مکرِہ" یعنی مجبور کرنے والے کے ذمہ ضمان لازم ہوگا البتہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکراہ کی صورت میں بھی دوسرے مسلمان کا مال تلف کرنا حرام ہے کیونکہ یہ حق العبد ہے۔

قال العلامة الزحيلي حفظه الله:

"إذا أكره إنسان على إتلاف مال مسلم، فيرخص له عند الإكراه التام الملجئ، لأن مال الغير يباح عند الضرورة، وعند شدة المخمصة والمجاعة، والضرورة متحققة هنا بسبب الإكراه، قال تعالى: ﴿فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه﴾ والرخصة هنا ترفع عنه إثم المؤاخذة الأخروية. والمراد بالإكراه التام هو إحراق النمال، أو ما في معناه عند الجمهور الشافعية، والحنفية، والحنابلة"

(انظر الفقه الإسلامي وأدلته للدكتور وهبة الزحيلي: ٥/٢٩٤)

وقال المالكية: لا يرخص له في الإتلاف، لتعلق حق العبد به، وقد قال صلى الله عليه وسلم:

"كل المسلم على المسلم حرام: دمه، وماله، وعرضه،"

والصحيح قول الجمهور.

قال في ملتقى الأبحر: وإن أكره على إتلاف مال مسلم، بالقتل، أو قطع عضو منه، رخص له أن يفعل ذلك، والضمان على المكره".

(ملتقى الأبحر: ٢/١٨٠)

## خنزیر کا گوشت یا شراب نوشی پر مجبور کرنا:

اگر کسی مسلمان کو خنزیر کے گوشت کھانے یا شراب نوشی پر مجبور کیا جائے یا بتوں کو سجدہ کرنے پر

مجبور کیا جائے، رمضان کے روزے توڑنے پر مجبور کیا جائے، یا غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنے پر مجبور کیا جائے ایسے موقع پر دیکھے کہ یہ جبر واکراہ کس نوعیت کا ہے اگر مار پیٹ قید وغیرہ کا ہے تو ہرگز حرام کا ارتکاب نہ کرے اور اگر قتل یا کسی عضو کے تلف کرنے کا ہے جس کو پہلے اکراہ ملجی کی مثال لکھا گیا تو پھر ان گناہوں کا ارتکاب کرکے اپنی جان بچانا ضروری ہے، بلکہ اس موقع پر واجب ان امور کا ارتکاب کرکے اپنی جان بچانے اگر حرام سے بچتے ہوئے صبر کرے اور قتل ہوجائے تو گناہ گار ہوگا کیوں کہ اس نے اپنے نفس کو ہلاکت کے لئے پیش کردیا۔

## قتل یا زنا پر مجبور کرنا:

اگر کسی انسان کو دوسرے انسان کے قتل پر یا زنا کرنے پر مجبور کیا جائے تو شرعاً اس کے لئے حلال نہیں کہ دوسرے انسان کو قتل کرے اگرچہ اس مجبوری میں جان چلی جائے، کیوں کہ دوسرے مسلمان کا قتل کسی حال میں بھی حلال نہیں کیوں کہ اس مجبور انسان کی جان دوسرے انسان کے مقابلہ میں کوئی زیادہ قیمتی نہیں۔

قال العلامة الصابوني رحمه الله تعالى:

وإذا أكره إنسان على قتل غيره، أو أكره على الزنى، فلا يحل له أن يقدم على ذلك، ويجب أن يصبر، ولو أدى به ذلك إلى تعريض نفسه للخطر، لأن هذا مما لا تبيحه الضرورة، فليست نفس الإنسان أعز ولا أغلى من نفس غيره، حتى يقدم على قتله، فكما يحرص على حياته، ينبغي أن يحرص على حياة الناس، فإن قتله أثم، لأن قتل المسلم حرام، لا يباح لضرورة ما، سواء كان اكراها بالقتل أو غيره.

قال الإمام القرطبي: "أجمع العلماء على أن من أكره على قتل غيره، أنه لا يجوز الإقدام على قتله، ولا انتهاك حرمته، ويصبر على البلاء الذي نزل به، ولا يحل له أن يفدي نفسه بغيره، ويسأل الله العافية في الدنيا والآخرة" والله تعالى اعلم وصلى الله على سيدنا محمد وآله وصحبه وسلم.

(تفسير القرطبي: ١٠/١٩٧)

## معاملات میں اکراہ:

وہ معاملات جن کے انعقاد کے لئے دل سے رضامند ہونا شرعاً ضروری ہے، جیسے خرید و فروخت، ہبہ وغیرہ۔

كما قال تعالىٰ: ﴿إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم﴾

یعنی کسی دوسرے کا مال حلال نہیں ہوتا، جب تک کہ تجارت وغیرہ کا معاملہ طرفین کی رضامندی سے نہ ہو۔

وكما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم: "لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه."

یعنی کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے اس کے دینے پر راضی نہ ہو، اگر ایسے معاملات جبر و اکراہ کے ساتھ کرالئے جائیں تو شرعاً ان کا اعتبار نہیں، اکراہ کی حالت سے نکلنے کے بعد اس کو اختیار ہوگا کہ بحالت اکراہ جو بیع ہبہ وغیرہ کیا تھا اس کو اپنی رضامندی سے باقی رکھے یا فسخ کردے۔ (معارف القرآن: ۵/۴۰۷، آیت ۱۰۶ سورۃ النحل)

## نکاح و طلاق میں اکراہ:

ایسے معاملات جن کا مدار صرف زبانی الفاظ کہہ دینے پر ہے دل کا قصد و ارادہ یا رضا و خوشی انعقاد معاملہ کے لئے شرط نہیں ہے جیسے نکاح، طلاق، عتاق وغیرہ ایسے معاملات کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے:

ثلاث جدهن جد وهزلهن جد: النكاح والطلاق والرجعة.

رواه ابو داؤد والترمذي وحسنه

یعنی دو شخص زبان سے نکاح کا ایجاب و قبول شرائط کے مطابق کرلیں یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو زبان سے طلاق دیدے، یا طلاق کے بعد زبان سے رجعت کرے، خواہ وہ بطور ہنسی مذاق کے ہو دل میں ارادہ نکاح یا طلاق یا رجعت کا نہ ہو پھر بھی محض الفاظ کہنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا اور طلاق پڑ جائے گی، نیز رجعت صحیح ہو جائے گی۔ (مظہری)

امام اعظم ابو حنیفہ، شعبی، زہری، نخعی، قتادہ رحمہم اللہ کے نزدیک طلاق "مکرہ" کا بھی یہی حکم ہے کہ حالت اکراہ میں اگرچہ طلاق دینے پر دل سے آمادہ نہیں تھا مجبور ہو کر الفاظ طلاق کہہ

دیئے، اور وقوع طلاق کا تعلق صرف الفاظ طلاق ادا کر دینے سے ہے، دل کا قصد و ارادہ شرط نہیں، جیسا کہ حدیث مذکور سے ثابت ہے اس لئے یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔

(معارف القرآن: ۸۱۰/۲)

## کسی کو خودکشی پر مجبور کیا جائے اس کا حکم:

اگر کسی انسان کو مجبور کیا جائے کہ خودکشی کر لے ورنہ ہم تجھے قتل کر دیں گے تو اس صورت میں بھی خودکشی کرنا حرام ہے کیونکہ مکرہ کے لئے فعل حرام کا ارتکاب اس وقت جائز ہے جب اس سے جان بچ جائے، خودکشی میں تو اپنے ہاتھ سے جان کو تلف کرنا ہے جو کہ ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا ایسے موقع پر صبر کرے، اگر جان چلی جائے تو شہادت کا مرتبہ حاصل ہوگا۔

# احکام الشفعہ

## حق شفعہ کے شرعی احکام

### حق شفعہ کی تعریف:

قال صاحب ملتقی الابحر: هي تملك العقار على مشتريه بما قام عليه جبرا، اي تملكه بالثمن الذي باعه به جبرا عنه

(ملتقى الابحر: ١٩٥/٢)

### حق شفعہ کی مشروعیت:

شریعت مطہرہ نے ہر انسان کو آزادی اور سکون کے ساتھ زندگی گذارنے کا حق دیا ہے، اگر کسی کے پڑوس میں کوئی ایسا شخص آباد ہو جس کے عادات و اخلاق پسندیدہ نہ ہوں تو ان کے ساتھ زندگی گذارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، بسا اوقات انسان تنگ ہو کر وہاں سے کوچ کر جاتا ہے۔

کما قال الشاعر:

دار جار السوء ان جار وان

لم تجد صبرا فما احلى النقل

یعنی وہ گھر جس کا پڑوسی برا ہے، اگر اس کی ایذاء پر صبر ممکن نہ ہو تو وہاں سے کوچ کر جانا ہی اچھا ہے۔

اس لئے بد سے پڑوسی کے شر سے بچنے کے لئے شریعت نے شفعہ کا حق دیا ہے کہ اگر کسی کے پڑوس میں کوئی مکان، دکان، جائیداد، زمین فروخت ہو تو اسکی خریداری کا اصل حقدار پڑوسی ہے، لہٰذا اس میں بائع پر بھی کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، بلکہ جتنی قیمت پر دوسرے کو فروخت کرنا چاہتا ہے اتنے میں پڑوسی کو فروخت کرے جیسا کہ تعریف شفعہ سے ظاہر ہوا، اس کی مشروعیت پر بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ أما السنة: فهو ما رواه البخاری عن جابر بن عبد الله رضی الله عنه قال: قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم بالشفعة في كل مالم يقسم، فاذا وقعت الحدود، وصرفت الطرق، فلا شفعة "۔

(اخرجه البخاري: ۲/۳۲ من كتاب الشفعة، ومسلم رقم: ۱۶۰۸)

ومعنى قوله صلى الله عليه وسلم " وصرفت الطريق " اى انتهى أمر البيع ببيان مصارف الطرق، ولم يطلب الجار حقه في الشفعة، فلا شفعة له۔

۲۔ وروى الامام احمد وأصحاب السنن عن جابر رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " الجار أحق بشفعة جاره، ينتظر بها وان كان غائباً، اذا كان طريقهما واحداً "۔

(اخرجه أحمد في المسند: ۴/۳۸۸، والترمذي رقم: ۱۳۷۰، وأبو داؤد رقم: ۳۵۱۳، والنسائي: ۷/۳۰۱)

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شفعہ کا فیصلہ فرمایا تھا ہر اس جائیداد میں جو تقسیم نہ ہوئی ہو جب تقسیم کے بعد حد بندی ہوگئی (اور پڑوسی نے حق شفعہ کا مطالبہ نہ کیا) اب حق شفعہ باقی نہ رہا۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پڑوسی شفعہ کا زیادہ حقدار ہے، اگر وہ بیع کے وقت موجود نہ ہو تو اس کے آنے کا انتظار کیا جائے گا، جب دونوں کا راستہ ایک ہو۔

(۳) وروى البخاري عن عمرو بن الشريد قال: " وقفت على

سعد بن أبي وقاص، فجاء المسور بن مخرمة، فوضع يده على إحدى منكبي، إذ جاء "أبو رافع" مولى النبي صلى الله عليه وسلم، أي عبده ومملوكه، فقال: يا سعد! ابتع مني بيتي في دارك، فقال سعد: والله ما أبتاعهما، أي لا أشتريهما!!

فقال المسور: والله لتبتاعنهما!

فقال سعد: والله لا أزيدك على أربعة آلاف منجمة، أي على أربعة آلاف درهم (منجمة) أي مفرقة على دفعات!"

قال أبو رافع: لقد أعطيت بها خمسمائة دينار، يعني خمسة آلاف درهم، ولولا أني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: "الجار أحق بسقبه" أي أحق بالشفعة بسبب قرب داره من دار جاره، ما أعطيتكها بأربعة آلاف، وأنا أعطى بها خمسمائة دينار، قال: فأعطاه إياه".

(أخرجه البخاري في كتاب الشفعة ۔ ۲/ ۳۲ باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع)

(۴) وروى مسلم عن جابر رضي الله عنه قال: "قضى رسول الله بالشفعة في كل شركة، أي شراكة لم يقسم، ربعة، أي منزل، أو حائط، أي بستان، لا يحل له أن يبيع، حتى يستأذن شريكه، فإن شاء أخذ، وإن شاء ترك. فإذا باع ولم يستأذنه، فهو أحق به" أي أحق بالمبيع من المشتري.

فهذه نصوص نبوية صريحة وواضحة، في أن للجار والشريك حق الشفعة فيما يبيعه جاره، رعاية لحق الجوار، ودفعاً للضرر الذي ينشأ عن مجاورة شخص أجنبي غريب، لا سيما إذا كان عدواً أو خصماً!! . (فقه المعاملات)

## حق شفعہ کا پہلا حق دار:

سب سے پہلے حق شفعہ اس شریک کو حاصل ہوگا جو مالک کے ساتھ نفس مبیع میں شریک ہو،

میں ان شرائط کے فقدان کی وجہ سے حق شفعہ باطل ہو جائے گا، البتہ اگر مشتری یا ثمن کا علم نہ ہونے کی وجہ سے شفیع نے سکوت کیا اور علم ہو جانے کے بعد فوراً طلب مواثبہ وطلب تقریر کی تو طلبهما المعتبرة کی وجہ سے حق ساقط نہیں ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى معزيا الى الخانية: اخبر بالبيع فسكت قالوا لا يبطل حقه ما لم يعلم المشترى والثمن (الى قوله) اقول وبه افتى المصنف الغزي تبعا للحانوتي في فتاواه فليحفظ.

(رد المحتار: ۵/ ۲۳۸، ماخوذ از احسن الفتاوی: ۷/ ۳۰۴)

## بوقت بیع موت شفیع میں اختلاف:

سوال: زید نے اپنے والد کی وفات کے بعد بالغ ہوتے ہی بکر پر شفعہ کا دعوی کر دیا جبکہ بیع تمام ہوا تب شفعہ پہلے مکمل کئے جا چکے تھے، بکر نے کہا کہ چونکہ بوقت بیع تمہارے والد زندہ تھے اور انہوں نے اس وقت کوئی دعوی نہیں کیا لہذا اب تمہارا دعوی لا حاصل ہے، زید نے بوقت بیع اپنے والد کی وفات پر بینہ قائم کئے اور بکر نے اس کی زندگی پر بینہ قائم کئے اب کس کے گواہوں کو ترجیح ہوگی؟ بینوا توجروا

جواب: مندرجہ ذیل جزئیات سے بظاہر اس مسئلہ پر استشہاد کیا جا سکتا ہے:

(۱) قال الامام قاضي خان رحمه الله تعالى: اذا شهد رجلان ان زوج فلانة قتل او مات وشهد آخران انه حي كانت شهادة الموت والقتل اولى. (خانية بهامش العالمگيرية: ۲/ ۴۸۴)

(۲) وقال في الفتاوى المهدية: ان الاصل تقديم بينة الموت على بينة الحياة لانها تثبت امرا عارضا كما هو الاصل في البينات ففي الفصل الثالث عشر من العمادية اذا شهد رجلان ان زوج فلانة قتل او مات وشهد آخران انه حي كانت شهادة الموت والقتل اولى لان الموت يثبت العارض اه ثم في تنقيح الحامدية بينة زوج فلانة قتل او مات اولى من بينة انه حي الا اذا اخبر بحياته بتاريخ لاحق اه (الى ان قال) فبينة الموت اولى مطلقا كما هو ظاهر اطلاقهم له

والتوجيه المجازي مطلق عن قيد التاريخ وعدمه وتأخره وتقدمه فتح .

(فتاوى مهدية : ص ٣٦٧)

(٣) وقال العلامة ابن نجيم رحمه الله تعالى : يوم الموت لا يدخل تحت القضاء ويوم القتل يدخل كذا في البزازية والولوالجية والفصول وعليها فروع .

(٤) وقال العلامة الحموي رحمه الله تعالى تحت قوله وعليها فروع لو برهن ان من شهد وا على اقراره في وقت كذا كان ميتا في ذلك الوقت لا يقبل لان زمان الموت لا يدخل تحت القضاء حتى اذا برهن ان فلانا مات يوم كذا وادعت امرأة نكاحا بعد ذلك اليوم وبرهنت يقبل بخلاف زمان القتل والنكاح حيث يدخلان تحت القضاء ومنها لو ادعى ان اباه مات يوم كذا وقضى ثم ادعت امرأة النكاح بعده بيوم تقبل فهذا والذي قبله مما فرعوه على الاول ومما فرعوه على الثاني لو برهن الوارث على انه قتل يوم كذا فبرهنت المرأة ان هذا المقتول نكحها بعد ذلك اليوم لا تقبل .

(شرح الاشباه والنظائر، الفن الثاني : ١/٣٤٦)

جزئیہ اولیٰ و ثانیہ سے بینۂ شفیع کی اولویت معلوم ہو رہی ہے مگر ان سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ صورت مسئلہ میں شفیع کے والد کی موت و حیات میں تنازع نہیں، اس کی موت پر جانبین متفق ہیں، تنازع امرین حادثین (الموت والشراء) کے تقدم و تأخر میں ہے۔

جزئیہ ثالثہ و رابعہ سے بظاہر بینۂ مشتری کی ترجیح معلوم ہو رہی ہے مگر بنظر غائر بینۂ شفیع کی ترجیح ثابت ہوتی ہے اس لئے کہ جزئیات مذکورہ میں مدعیہ نکاح کے بینہ کے قبول ہونے کی علت یہ ہے کہ یہ مدعیہ حق اور جانب آخر اس کے حق کی منکر ہے اور اصولاً مدعی حق کا بینہ راجح ہوتا ہے بصورت متنازع فیہا چونکہ شفیع مدعی حق ہے اور مشتری منکر لہٰذا شفیع کا بینہ راجح ہوگا۔

علاوہ ازیں اگر بالفرض مشتری کے بینہ ہی کو ترجیح ہو تو بھی یہ مشتری کے لئے مفید نہیں اس لئے کہ وقت شراء مبیع کے والد کی محض حیات ثابت ہو جانے سے حق شفعہ ساقط نہ ہوگا جب تک

## تبادلہ جائیداد میں بھی حق شفعہ ثابت ہو جاتا ہے:

مثلاً زید و بکر نے ایک دوسرے سے اپنی جائیداد کا تبادلہ کیا، بکر کے رشتہ دار عمرو نے زید و بکر پر حق شفعہ کا دعویٰ کیا تو شرعاً یہ دعویٰ صحیح ہوگا کیوں کہ تبادلے سے بھی حق شفعہ ثابت ہوتا ہے۔

لأن فيه تمليك بعوض المال. وفي الدر المختار: (لا تثبت قصداً إلا في عقار ملك بعوض) خرج الهبة (هو مال) خرج المهر (وإن لم) يكن يقسم اهـ.

(ماخوذ از امداد الاحکام: ٤/١٧٦)

## شفعہ کے متفرق مسائل:

1..... شفیع کو معلوم ہوا کہ مثلاً زید نے اس کے برابر کی زمین خریدی ہے تو شفیع اس پر راضی ہو گیا کیوں کہ وہ زید کی شرافت سے واقف ہے بعد میں معلوم ہوا کہ خریدار تو خالد ہے جبکہ شفیع کے علم کے مطابق خالد شر پسند آدمی ہے، تو شفیع کا حق شفعہ ساقط نہ ہوگا کیوں کہ پہلے اس کو دھوکہ دیا گیا ہے۔

2..... جس طرح مسلمان کو حق شفعہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح ذمی کو بھی یہ حق حاصل ہوتا ہے کیونکہ دفع ضرر کی ضرورت میں دونوں برابر ہیں لہٰذا حق شفعہ میں بھی دونوں برابر ہوں گے۔

3..... مجلس قضاء میں دعویٰ شفعہ دائر کرنے اور مقدمہ کے فیصلے کے وقت ثمن کا حاضر کرنا ضروری نہیں البتہ جب اس کے حق میں شفعہ کا فیصلہ ہو گیا تو اب ثمن کی ادائیگی لازم ہے۔

4..... شفیع کو بھی خیار رویت اور خیار عیب حاصل ہوگا کیوں کہ شفعہ کے ذریعہ لینا اصل خریداری کی طرح ہے، لہٰذا جو حق مشتری کو حاصل ہے وہ شفیع کو بھی حاصل ہوگا۔

# احکام المساقاۃ والمزارعہ

## باغات اور درختوں کو بٹائی پر دینے کے احکام

مساقاۃ کا معنی: اپنے درخت یا باغ کو کسی دوسرے کے حوالے کرنا تاکہ وہ اس کو سیراب کرے اور اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کو اس قابل بنائے کہ اس میں زیادہ پھل لگے، اور شرط یہ ٹھہرائے کہ پیدا ہونے والے پھل کا ایک معین حصہ اجرت میں دیا جائے گا۔

هي دفع الشجر إلى من يسقيه ويصلحه ، بجزء معين من ثمره .

( ملتقى الأبحر : ٢ / ٢١٣ )

شرعاً یہ معاملہ مشروع ہے، جناب رسول اللہ ﷺ نے اہلِ خیبر کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا تھا کہ جب خیبر فتح ہوا، تو وہ علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا پھر آپ ﷺ نے ان کے ساتھ معاہدہ فرمایا کہ تم لوگ خود ان باغات کی دیکھ بھال کرو، اور جو پھل لگے اس کا آدھا حصہ رسول اللہ ﷺ کو بھیجا کرو۔

المساقاة مشروعة بالسنة المطهرة ، وهي صحيحة عند جمهور العلماء ، فهي كالمزارعة ، والأصل فيها أنها لا تجوز ، لأنها شركة على شيء مجهول ، فقد يخرج النبات وقد لا يخرج الثمر ، ولهذا خالف فيها بعض الفقهاء ، ولكن حاجة الناس إليها تجعلها مشروعة ، وإن كانت مخالفة للقياس ، وقد وردت السنة بتقريرها ، فلا عبرة بخلاف من خالف فيها .

فقد روى البخاري ومسلم عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما أنه قال :

"عامل النبي صلى الله عليه وسلم أهل خيبر بشطر ، أي نصف ما يخرج من ثمر أو زرع " .

( أخرجه البخاري : ٣ / ٦٤ ، ومسلم في صحيحه )

فالثمر هنا يراد به شجر النخيل الذي اشتهرت به خيبر وهو نص صريح في المساقاة ، فقد عاملهم صلى الله عليه وسلم ، بأن يأخذوا النصف مقابل خدمتهم للشجر .

وقد اقتصر بعض الفقهاء على جواز المساقاة في شجر النخيل والكرم ، أي العنب ، لأن أهل المدينة كانوا يتعاملون بهما مساقاة ، كما هو مذهب الشافعية .

وأجاز فقهاء الحنفية المساقاة في جميع أنواع الشجر ، ما كان

منه منتفعا، وما كان غير مثمر، كشجر الحور الذي ينتفع به، لا يجوز المساقاة والرطب، قياسا على شجر النخل، لأن الجواز للحاجة وقد عمت، والأصل العموم لا التخصيص.

قال صاحب الهداية: وتجوز المساقاة في النخل والشجر والكرم والرطاب وغير ذلك لأن أهل خيبر كانوا يتعاملون في الأشجار والرطاب أيضا، والأصل في النصوص أن تكون معلولة، أي تصح منها الحكمة والعلة، والجامع دفع الحاجة، فإن ذا المال قد لا يهتدي إلى العمل، والقوي عليه لا يجد المال، فمست الحاجة إلى انعقادها كالمزارعة. (الهداية: ٤/٣٩٠)

## مساقاۃ کی شرائط:

(۱) عمل صرف عامل کے ذمہ ہو، مالک باغ کا کسی عمل میں شریک نہ ہوگا، یہی مساقاۃ کا تقاضا ہے۔

(۲) باغ مکمل طور پر عامل کے حوالہ کردیا جائے تاکہ وہ باغ کی درستگی، نالے وغیرہ بنانا، زائد کانٹے وغیرہ کاٹنے کا عمل یکسوئی کے ساتھ انجام دے سکے۔

(۳) پیداوار کے بعض حصے کو اجرت ٹھہرایا جائے مثلاً آدھا، یا تہائی، یا چوتھائی، مثلاً اگر اجرت اس طرح متعین کرے کہ پیداوار میں سے مثلاً دس من میرا ہوگا باقی تمہارا، تو عقد مساقاۃ باطل ہوجائے گا، کیونکہ بسا اوقات ہوسکتا ہے کہ کل پیداوار ہی صرف دس من ہو یا اس سے کم، اس صورت میں عامل کا نقصان ہوجائے گا۔

(۴) اسی طرح مدت متعین ہونی چاہیے، وہ مدت جس میں آسانی کے ساتھ ایک مرتبہ پھل لگ کر تیار ہوجائے اور اس کو اتارا جاسکے، اگر ایسی مدت مقرر کی کہ جس میں عام طور پر ایک مرتبہ پھل لگ کر تیار نہیں ہوتا تو اس سے عقد مساقات فاسد ہوجائے گا، کیونکہ پیداوار میں دونوں کی شرکت کا جو مقصد ہے وہ مفقود و فوت ہوجائے گا۔

قال الفقهاء: فإن سميا في المعاملة، أعني المساقاة، وقتا يعلم أنه لا يخرج منها الثمر، فسدت المساقاة لفوات المقصود وهو الشركة

مالک الأرض مع الفلاح لیزارع بإعطائه ثلث أو ربع أو نصف ، ما یخرج من النبات ، وتزرع علی أن یزرعها ویعمل فیها .

عقد مزارعہ وہ ہے جس میں زمین کا مالک کسان سے اس طرح معاہدہ کرتا ہے کہ کسان اس زمین میں کھیتی باڑی کرے اور جو پیداوار حاصل ہوگی اس کا آدھا یا تہائی یا چوتھائی حصہ کسان کو دیا جائے گا بقیہ مالک کا ہوگا۔

قال العلامة الموصلي رحمه الله: هي عقد على الزرع ببعض الخارج وهي جائزة عند أبي يوسف ومحمد لأن النبي صلى الله عليه وسلم عامل من أهل خيبر على نصف ما يخرج من ثمر وزرع ، ولأن الحاجة ماسة إليها لأن صاحب الأرض قد لا يقدر على العمل بنفسه ولا يجد ما يستأجر به ، والقادر على العمل لا يجد أرضا ولا ما يعمل به فدعت الحاجة إلى جوازها دفعا للحاجة كالمضاربة .

(الاختيار لتعليل المختار ٣/٧٤)

قال العلامة الشاطبي: وقد فعل ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فقد روى البخاري عن ابن عمر رضي الله عنهما قال :

" عامل النبي صلى الله عليه وسلم خيبر ، بشطر ( أي نصف ) ما يخرج منها من ثمر أو زرع ." ( أخرجه البخاري: ٢/٤٦ )

وفي رواية أخرى عنده عن ابن عمر : "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أعطى خيبر اليهود على أن يعملوها ويزرعوها ولهم شطر ما خرج منها" ( أخرجه البخاري : ٢/٤٧ )

وكذلك أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم تعاملوا بالمزارعة فقد حدث قيس بن مسلم عن أبي جعفر قال :

" ما بالمدينة أهل بيت هجرة إلا ويزرعون على الثلث والربع "

قال البخاري : وزارع علي ، وابن مسعود ، وعمر بن عبد العزيز ، وآل أبي بكر ، وآل عمر ، وآل علي ، وابن سيرين ، وقال عبد الرحمن

ابن الأسود : كنت أشارك عبد الرحمن بن يزيد في الزرع ، وعامل عمر الناس على ان جاء عمر بالبذر من عنده فله الشطر، النصف، وان جاءوا بالبذر فلهم كذا، وقال الحسن : لا بأس أن تكون الأرض لأحدهما ، فينفقان جميعاً، فما خرج فهو بينهما

(صحيح البخاري : ٢/ ٤٦١ باب المزارعة بالشطر ونحوه)

قال صاحب المغني : وهذا أمر مشهور ، عمل به رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى توفاه الله ، ثم خلفاؤه الراشدون حتى ماتوا، ثم أهلوهم من بعدهم ، ولم يبق بالمدينة أهل البيت الا عمل به، وعمل به أزواج رسول الله صلى الله عليه وسلم من بعده .

" وقد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما ظهر على خيبر ، أراد إخراج اليهود منها ، وصارت الأرض حين ظهر عليها لله ولرسوله ، وللمسلمين ، فسألت اليهود رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يقرهم بها، أى يتركهم ، على أن يكفوه عملها ، ولهم نصف الثمر، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم : نقركم بها على ذلك ما شئنا !!فقروا بها حتى أجلاهم عمر رضى الله عنه الى تيماء وأريحاء . "

(انظر صحيح البخاري : ٢/ ٤٨٠، المغني لابن قدامة : ٥/ ٤١٨ ، فقه المعاملات)

## صحت مزارعت کی شرائط:

صحت مزارعت کی شرائط کی تفصیلات کے لئے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال : مزارعت کے سلسلہ میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے، لہٰذا بٹائی پر زمین دینے کا جواز مع شرائط صاف صاف عام فہم مفصل تحریر فرمائیں، نیز مزارعت کے جواز میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ میں اختلاف ہے مفتی بہ قول کیا ہے؟ حدیث " من لم يترك المخابرة فليوذن بحرب من الله ورسوله " کا کیا مطلب ہے؟ بینوا توجروا

بعض ما يخرج منها، الربع والثلث ، وهذا الفهم رده ابن عباس رضي الله عنهما ، وبين أن النهي انما كان من أجل ارشادهم الى ما هو خير لهم ، فقال : "ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يحرم المزارعة . ولكن أمر أن يرفق الناس بعضهم ببعض فقال : "من كانت له أرض فليزرعها ، او ليمنحها اخاه ، فان ابى فليمسك ارضه .

(اخرجه البخاري من رواية جابر : ۴۹/۲ )

وهناك سبب اخر لحديث رافع بن خديج الذي يخبر بأن الرسول صلى الله عليه وسلم نهى عن المزارعة ، حدث عنه زيد بن ثابت رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم كان لفض النزاع فقال : يغفر الله لرافع بن خديج ، انا والله اعلم بالحديث منه ، انما جاء رجلان من الانصار قد اقتتلا فقال النبي صلى الله عليه وسلم : ان كان هذا شأنكم فلا تكروا اي تؤجروا ، المزارع فسمع رافع قوله فلا تكروا المزارع . ولم يعرف سبب هذا النهي . (اخرجه ابو داؤد والنسائي)

وبهذا اتضح الغرض من الحديث الشريف ، وبقي حل المزارعة على اصله من الاباحة والجواز ، كذلك اتضح معنى حديث جابر الذي رواه البخاري من حيث قال : كانوا يزرعون بالثلث ، والربع ، والنصف ، فقال النبي صلى الله عليه وسلم : من كانت له ارض فليزرعها ، او يمنحها فان لم يفعل فليمسك ارضه " .

هذا الحديث الشريف ايضا سببه وقوعه بعد المنازعات والخصومات بين بعض الانصار ، فاراد الرسول صلى الله عليه وسلم أن ينهي هذا الخلافات فنهاهم عن المزارعة ، وارشدهم الى ما هو الافضل والاصلح ولم يحرم عليهم التعامل بها . ( فقه المعاملات )

## ٹھیکہ داری اور صنعتی زمین کی پیداوار کا حکم:

اراضی پر سرکاری قبضہ زمینداروں کی ملک، کاشتکاروں کے ساتھ معاملہ کی شرعی حیثیت کی

تفصیلات کو سمجھنے کے لئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ایک تحقیقی سوال وجواب کی صورت میں نقل کی جاتی ہے

**السوال:** کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ آج کل جو تمام ہندوستان میں سرکار نے قانون قبضہ اراضی نافذ کر کے کاشتکاروں کو قبضہ دلایا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص دخیل کار اور موروثی کاشتکار ہو گیا ہے پیشتر دخیل کاروں کی تعداد کم تھی مگر اب ہر کاشتکار دخیل کار ہو گیا ہے زمیندار جس طریقے سے پیشتر کے دخیل کاروں سے ناخوش اور ناراض تھے اسی طریقے سے ان کاشتکاروں سے بھی ناخوش اور ناراض ہیں چونکہ زمینداروں کا منشا تو یہ ہے کہ ہر سال نئے نئے کاشتکاروں کو زمین دی جایا کرے اور اس لگان سے کچھ زر لگان تخمینہ کر لیا جایا کرے یہ بغیر پٹواری کے کاغذات میں بجائے بلعوض پٹہ کے درج کرا کر مال گذاری میں کمی کی جائے سرکار نے اس وجہ سے کل کو دخیل کار بنایا تا کہ زمیندار یہ غبن نہ کریں اور مال گذاری بمطابق وصولیت زر لگان ادا کاشتکار سے لے جایا کرے اس کے بعد سرکار نے یہ حق زمیندار کو دیا ہے کہ جو روپیہ تم اپنی جانب سے وصول کرو اس میں سے ۲۵ فی صدی رکھ کر باقی تحصیل میں داخل کر دو، اور احناف کا مذہب ہے کہ استیلاء کافر حربی مال مسلم سبب ملک کا ہے سرکار کا جس وقت آنا ہندوستان میں معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے یہی پتہ چلتا ہے کہ ملک پر قبضہ پورے طریقے سے ان کو حاصل ہوا، لہذا استیلاء کل ملک پر ظاہر ہے اس کے بعد قدر قدر سے قطعہ اراضی لوگوں کو دے گئے جن کو زمینداروں کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے مشہور تو ہے کہ زمیندار مالک اراضی نہیں لیکن بعض قانون دانوں سے نیز بعض زمینداروں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زمیندار مالک اراضی نہیں بلکہ ایک مقدار معین کے معاہدہ سے ٹھیکہ دار ہیں معاہدہ یہ ہے کہ فیصد آمدنی اراضی سے مثلاً مبلغ ۵۰ روپیہ ادا کریں، چنانچہ اگر ایک سال میں اس معاہدہ کے خلاف کرے تو اس کو اراضی سے سرکار علیحدہ کر دے گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمیندار مالک نہیں ہے بلکہ ٹھیکہ دار ہے اور اگر اس کو مالک ہی کہا جاوے تو اس قانون کے نفاذ کی وجہ سے سرکار کا استیلاء اراضی پر کیسا ہے جو موجب ملک ہے اور خود سرکار کا مقولہ ہے کہ زمیندار کوئی چیز نہیں کاشتکار یا ہم دولت کون ہیں، تو ان امور کو مد نظر رکھتے ہوئے ارشاد عالیہ سے سرفراز فرمایا جاوے کہ ان کاشتکاروں کا قبضہ اراضی پر جو بایجاز سرکار ہے جائز ہے یا ناجائز؟ اور ان کاشتکاروں کی آمدنی حلال ہے یا حرام؟ در صورت حرمت ان

لو قبضها المستأجر ليس له أن يؤجرها ولو آجرها وجب أجر المثل ولا يكون غاصباً اهـ.

فيه أيضاً: وفي الأشباه: المستأجر فاسداً لو آجر صحيحاً جاز ولو بعد قبضه في الأصح منية. اهـ. ( ٥/ ٤٣ )

قلت وهذا حكم المنافع وأما الأعيان المتولدة من المأخوذ إجارة فاسدة فحكمه في الحامدية: وفي الخلاصة رجل دفع إلى خياط ثوبا ليخيط له قباء أو جبة ولم يبين الأجرة فلما فرغ منه أعطاه صاحب الثوب زيادة على أجر مثله في قياس قول أبي حنيفة يطيب له وقال الفقيه أبو الليث الزيادة جائزة في قولهم جميعاً اهـ. ( ٣/ ١٤٩ )

قلت وإذا طاب للخياط الزيادة على أجر مثله فالظاهر جواز لبس القباء للمالك أيضاً ولعل وجه ذلك عندهما كونهما إجارات الناس. والله أعلم

ومنها لو زرع أرض الغير بغير إذنه يعتبر العرف فإن اقتسموا الغلة أنصافاً أو أرباعاً اعتبر وإلا فالخارج للزارع وعليه أجر المثل للأرض اهـ ثم نقل عن جامع الفصولين: ومن زرع أرض غيره بلا أمره يجب الثلث أو الربع على ما هو عرف القرية ثم رمز للفتاوى القاضي ظهير الدين زرع لا كارًّا سنين بعد مضي مدة الزراعة جواب الكتاب أنه لا يكون مزارعة فالزرع كله للأكار وعليه تصدق بما فضل من بذره وأجر المثل عمله وهكذا كانوا يفتون ببخارى وقيل تكون مزارعة وقيل لو كانت الأرض معدة للزراعة بأن كان ربها ممن لا يزرع بنفسه ويدفع مزارعة فلرب الأرض حصة على ما هو عرف تلك القرية لكن إنما يحمل على هذا لو لم يعلم وقت الزراعة أنه زرعها على وجه الغصب صريحاً أو دلالة أو على تأويل فإن من أجر أرض غيره بلا إذنه ولم يجز ربها وقد زرعها المستأجر فالزرع كله

لمستأجر لا على المزارعة إذ هي على وجه الإجارة لأنه زرعها متأولا (على
الإجارة) والحاصل أن في المسئلة قولين أو ثلاثة الأول أنه إذا زرع
أرض غيره بلا أمره لا يكون غصبا بل يحمل على المزارعة وحصة رب
الأرض ما جرى عليه عرف تلك القرية من نصف أو ربع والقول الثاني
جواب الكتاب أنه يكون غصبا والزرع كله له لكن تصدق ما فضل
عن بذره وأجر مثل عمله ويمكن حمل هذا على ما إذا لم يكن عرف
في أخذها على وجه المزارعة أو كان صاحبها أعدها للاستغلال بأن
كان يدفعها مزارعة لغيره ولا يزرعها بنفسه لأنه يكون قرينة على أن
المزارع إنما أخذها على وجه المزارعة على عرف تلك القرية أما
لو كان صاحبها يزرعها بنفسه يكون الزارع غاصبا والزرع كله له
اهـ (فتاوى حامدية ۲/۱۵۷ ـ ۱۵۸)

قلت وظهر من مجموع الكلام أن الزارع إنما يجب عليه
التصدق بما فضل عن بذره وأجر مثل عمله إذا كان غاصبا ولا يكون
غاصبا إذا لم تكن الأرض معدة للاستغلال أو كان صاحبها يزرعها
بنفسه وهذا كله فيما إذا زرع أرض الغير بدون إذنه وأما في صورة
المسئولة فلا يمكن القول بكون الزارع غاصبا لأنه يزرعها على
تأويل الإجارة ويزرعها بأن المالك لا بد أذنه فيكون مستأجرا لا
غاصبا فيكون الزرع كله له ولا يجب عليه التصدق بما فضل عن
بذره وأجر مثل عمله عند أبي يوسف خلافا لهما وللمالك أجر مثل
أرضه بالغا ما بلغ ولا ينقص عن المسمى لا يقال كيف يجب أجر
المثل بالغا ما بلغ والإجارة ليست بمجهولة بل مسماة وجب أن لا يزاد
على المسمى كما في المرقب علل فيه عدم الزيادة على المسمى
مرضاهما به. (۵/۴۶)

وفي الصورة المسئولة لا يكون المالك راضيا بالأجر الذي يؤديه

الا ما زاد على قيمة حق الزارع كما هو مقتضى قوله والله اعلم

خلاصہ روایات یہ ہوا کہ جو شخص غاصب ہو کر دوسرے کی زمین میں زراعت کرے اس کی زراعت کی پیداوار بھی تمام سب خبیث ہے جس کا تصدق واجب ہے۔

اور جو شخص اجارہ فاسدہ کے ساتھ دوسرے کی زمین میں زراعت کرتا ہے اس کی پیداوار بھی طرفین (امام ابو حنیفہ و محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک مطلقاً خبیث ہے الا بقدر بذرہ و اجر مثل عملہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے نزدیک بعض صورتوں میں جن میں بعض اجارات الناس ہو جائز ہے۔

جس صورت مسئولہ میں جبکہ مالک ارض جانتا ہے کہ مستاجر اپنی حیات تک زمین پر قابض رہے گا اور اس بات کو جانتے ہوئے زمین کو اجارہ پر دے رہا ہے تو مستاجر اس صورت میں غاصب نہیں البتہ یہ اجارہ فاسدہ جس میں مستاجر ایک شرط فاسد کر رہا ہے اور مدت اجارہ بھی مجہول ہے اس لئے اس کا حکم یہ ہے کہ خود اس مستاجر کے حق میں تو اس کی پیداوار کا وہ حصہ جو قدر تخم اور اجرت مثل عمل سے زائد ہو حلال نہیں علی قول الطرفین، اور دوسرے کے حق میں قول ابو یوسف پر اس کی کل پیداوار کو دفع حرج کے لئے جائز کہا جائے گا۔ کیونکہ اب اس میں ابتلاء عام ہو گیا ہے جس سے دوسروں کو قرض و رشوت سے بچانے کے لئے ایسے مستاجر کے حق میں دعوت و ہدیہ چندہ کی رقم لینے کو جائز کہا جائے گا، اور خود اس مستاجر کے حق میں چونکہ حرج نہیں ہے کیونکہ وہ اس اجارہ فاسدہ کا اپنے فعل سے مرتکب ہو رہا ہے تو اس کے حق پیداوار زائد علی القدر المذکور کو حرام کہا جائے گا، اور دوسروں کے لئے بھی یہ تو حکم صرف اس صورت میں ہے جبکہ مالک ارض ابتداء ہی سے کسی مستاجر کو حیاتی کاشتکار مان کر زمین اجارہ پر دے اور اگر مالک ارض نے ابتداء میں حیاتی کاشتکار مان کر زمین نہ دی تھی بلکہ ایک مدت معینہ کے لئے اجارہ پر دی تھی پھر مستاجر اس قانون جدید کی وجہ سے حیاتی کاشتکار دخیل کار بن گیا تو یہ شخص مدت معینہ کے تمام ہونے کے بعد غاصب شمار ہو گا، اور اس کی پیداوار زائد علی القدر المذکور سب کے لئے حرام ہے اس کے حق میں بھی اور دوسروں کے حق میں بھی، مگر یہ مدت معینہ اجارہ اولیٰ کے ختم ہونے پر اجارہ فسخ کر دے اور دوبارہ قانون جدید پر اجارہ کرے یا مالک ارض کو قانوناً اس کاشتکار کو الگ کر دینے کا مدت معینہ تک حق حاصل تھا اور مالک ارض نے عمداً اس کو الگ نہیں کیا تو اب یہ کاشتکار بھی صورت اولیٰ کے کاشتکاروں جیسا ہو گیا۔ فحکمہ کحکم الاول

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ اصل میں ان دخیل کاروں اور گذشتہ زمانے کے دخیل کاروں میں فرق ہے کیونکہ گذشتہ زمانے کے دخیل کار ان زمینوں کا کرایہ مدت معینہ کے لئے ادا کرتے تھے پھر وہ بدون رضا مالک کے زمین سے بعض قانون کی وجہ سے قابض اور دخیل کار بن جاتے ہیں جس میں وہ بحکم غاصب تھے اور اس وقت جو کاشتکاری ہے اس میں لیتے ہیں تو مالک زمین اس کو اس کاشتکار کو زمین دیتا ہے تو وہ اس کے قبضہ میں اس کی رضامندی سے ہے سرمایہ کروں سے کہاں راضی ہے بلکہ قانون کی وجہ سے مجبور ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ قانوناً زمین کاشت کے لئے دینے پر مجبور نہیں اگر وہ خود کاشت کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور جب وہ خود کاشت نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو زمین دے رہا ہے اور جانتا ہے کہ یہ کاشتکار بنتے ہی دخیل کار ہو جائے گا، تو اس کا اس حالت میں زمین دینا کاشتکار کی دخیل کاری پر رضا ہے، نیز قانون نے زمین کے مالک کی زبان تو بند نہیں کی ہے وہ اس قانون کے بعد بھی زبان سے کہہ سکتا ہے کہ میں یہ زمین مدت معینہ کے لئے (مثلاً دو سال کے لئے) جا رہا ہوں اس سے زائد کے لئے میں راضی نہیں ہوں، اگر وہ زبان سے ایسا کہہ دے تو اس کاشتکار کا اب بھی مدت معینہ کے بعد وہی حکم ہوگا جو گذشتہ دخیل کاروں کا حکم تھا لیکن جب وہ زبان سے کوئی مدت متعین نہیں کرتا اور قانون حال سے واقف ہے تو دلالۃً وہ مستاجر کی شرط دخیل پر راضی ہے اس صورت میں مستاجر کو غاصب مثل گذشتہ دخیل کاروں کے نہ سمجھا جائے گا ہاں اس قانون سے نفع لینے میں وہ گناہگار ضرور ہے، اس کے حق میں اس کی پیداوار حرام نہیں ہے [illegible] لیکن غاصب نہ ہونے کا اثر دوسروں کے حق میں بصورت توسع ظاہر ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم

(ماخوذ از امداد الاحکام ج ۴ ص ۱۷۵، کتاب الغصب)

# احکام احیاء الموات

## یعنی بنجر غیر مملوکہ زمین کو آباد کرنے کا حکم

### غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا مطلب:

آبادی سے دور کوئی زمین جس کا کوئی مالک معلوم نہیں ہے آباد پڑی ہوئی ہے، اب کوئی شخص اس کو درست کر کے قابل کاشت بناتا ہے تو وہ اس زمین کا مالک ہو جائے گا۔

ایک کے انتقال کے بعد یہ معاہدہ خود بخود ختم ہو جائے گا اس کی اولاد کو کاشتکاری کا حق نہ پہنچے گا، کیوں کہ وراثت مملوک میں ہوتی ہے، حقوق مجردہ میں نہیں ہوتی، نیز اگر زمیندار کچھ عوض لےکر زمین کو موروثی کر دے تو بھی زمین شرعاً موروثی نہ ہوگی اور زمیندار نے جو رقم لی ہے وہ رشوت ہے، اس کا تصرف میں لانا حرام ہے، کاشتکار اپنی رقم واپس لے سکتا ہے۔

قال في الدر والأشباه: لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة، كحق الشفعة، (٤/٢٠، ملخص از امداد الاحکام: ٤/١٧٦)

## حاکم رعایا کو غیر آباد زمین دے سکتا ہے:

حکومت کو حق حاصل ہے کہ غیر آباد زمین کسی کو دیدے تاکہ وہ اس کو آباد کرے، البتہ ایسی زمین نہ دے جو عام لوگوں کی ضرورت کی ہے، مثلاً راستہ، نہر وغیرہ۔

نبی کریم ﷺ نے بلال بن حارث کو "عقیق" نامی زمین بطور قطع کے دی تھی جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلافت کا زمانہ آیا تو انہوں نے حضرت بلال سے فرمایا:

ما أقطعك رسول الله صلى الله عليه وسلم لتحتجزه على الناس، إنما أقطعك لتعمره فخذ منها ما قدرت على عمارته ورد الباقي.

(أخرجه سعيد في سننه كما في المغني: ٥/٥٧٠)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے تمہیں زمین محض چار دیواری کی غرض سے نہیں دی تھی بلکہ دینے کا مقصد اس کو آباد کرنا تھا، جتنی زمین آباد کر سکو وہ تو تمہاری ہوگی اور جو غیر آباد رہ گئی ہے اس کو واپس کردو۔

روى الترمذي عن علقمة بن وائل عن أبيه أن النبي صلى الله عليه وسلم أقطعه أرضا بحضرموت

(أخرجه الترمذي رقم: ١٣٨١ وقال حسن صحيح)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو "حضر موت" میں ایک زمین بطور قطع کے دی تھی۔

وكذا أقطع صلوات الله عليه ناسا من جهينة أو مزينة فعطلوها، فجاء قوم فأحيوها، فخاصمهم الذين أقطعهم رسول الله صلى الله

عليه وسلم، ثم عمر رضي الله عنه، فقال عمر رضي الله عنه: لو كانت قطيعة مني أو من أبي بكر لم أردها إلى أن رجعها إليهم، ولكنها قطيعة من رسول الله صلى الله عليه وسلم فأنا أردها، ثم قال عمر: من كانت له أرض فعطلها ثلاث سنين فجاء قوم فعمروها فهم أحق بها (فقه المعاملات)

## غیر آباد زمین کو آباد کرنے کی شرائط:

(۱) غیر آباد زمین کسی کی ملک میں نہ ہو کیوں کہ غیر آباد مملوکہ زمین مالک کی اجازت یا مالک سے خریدے بغیر کسی غیر کے لئے آباد کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اگرچہ بالکل ہی بے کار پڑی ہوئی ہو۔

(۲) یہ زمین کسی آباد زمین کی ضرورت میں سے نہ ہو، مثلاً کسی گھر کا صحن یا کسی کنویں کا صحن وغیرہ نہ ہو۔

كما روي: من حفر بئراً فله مما حولها أربعون ذراعاً عطناً لماشيته. (أخرجه ابن ماجه باب حريم البئر رقم: ۲۴۸۶)

(۳) زمین ملنے کے بعد تین سال پورے ہونے سے قبل اس کو آباد کرنا ضروری ہے۔

تم الجزء الثاني من

**"جدید معاملات کے شرعی احکام"**

بحمد الله سبحانه تعالى

في ثمانية عشر من شعبان ۱۴۲۷ھ ويليه الجزء الثالث

إن شاء الله تعالى